پانچواں باب: عابد سہیل کے تراجم و دیباچے

الف: ترجمہ کا فن اور روایت

ب: عابد سہیل کی ترجمہ نگاری و دیگر کتب

- غیر مرئی انسان
- درد کا شجر
- حرف کائنات
- رحمٰن رنگ
- باغات
- اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل
- انتخاب مضامین احمد جمال پاشا
- فکشن کی تنقید
- افسانیات

☆ترجمہ کافن

ترجمہ کاتعلق انسانی سرشت سے ہے۔ ہم آپس میں جوگفتگو کرتے ہیں اور جوالفاظ ادا کرتے ہیں یا پھر جو باتیں تحریر کرتے ہیں بظاہر یہ تمام افعال تخلیقی عمل سے متعلق نظر آتے ہیں مگر اصل میں یہ ترجمانی ہے ان خیالات کی جو ہمارے ذہن ودل کے نہاں خانوں میں جنم لیتے رہتے ہیں۔ایک گونگا شخص اپنے خیالات کے ابلاغ کے لئے جو اشارے کرتا ہے وہ بھی اس کے تخیلات کی ترجمانی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدرت نے انسانی فطرت میں ”ترجمہ“ کرنے کی صلاحیت پوشیدہ رکھی ہے۔

جیسے جیسے انسانی تمدن وفکر بشری نے ترقی کی اور زندگی نے اپنی باہوں میں قدرت کے مخفی ومنتشر حقائق کو سمیٹنا شروع کیا ویسے ویسے کائنات کے تصور میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور طرز حیات بدلتا چلا گیا۔ یہ تبدیلی سماج کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے تمام رویوں میں نظر آئی۔ جب دنیا میں انسانوں کی تعداد بس ایک خاندان میں محدود تھی تو ترجمہ کا وجود لفظوں کے ذریعہ تھا۔ جب یہی انسان طبقات اور گروہوں میں منقسم ہو گئے تو ترجمہ پیغام رسانی کی شکل میں ایک دوسرے کے مقصد وارادے سے آگاہی کا کام انجام دینے لگا خواہ وہ متعین اشاروں کے ذریعہ ہو یا پھر مخصوص آوازوں کی مدد سے۔لیکن جب انسانی تعداد میں اتنا اضافہ ہوگیا کہ اس نے اپنی الگ علاقائی اور لسانی شناخت قائم کر لی تب ترجمہ نے بھی اپنی شکل تبدیل کرتے ہوئے نہ صرف دوزبان کے مابین تفہیمی تعلق پیدا کیا بلکہ دوملک اور دوتہذیب کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر لی جس کی مدد سے دنیا آج ترقی کرنے میں کامیاب رہی۔اس سے ترجمہ کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس ”ترجمہ“ کی تعریف کیا کی جائے۔مذکورہ باتوں کا ہی نام ترجمہ ہے یا پھر یہ اپنی ایک معروضی تعریف بھی رکھتا ہے۔ جواباً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو باتیں گزشتہ اقتباسات میں کہی گئی ہیں وہ ”ترجمہ“ کے اس عمل سے تعلق رکھتی ہیں جو انسانی شعور کا حصہ ہیں اور ہر انسان چھوٹے بڑے پیمانے پر اس عمل کو انجام دیتا ہے۔ الّا آخری بات کے۔حالانکہ اس میں بھی مدارج قائم کئے جاسکتے ہیں۔یعنی جب دوزبانوں کے درمیان ترجمہ کی مدد سے ”لین دین“ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور یہ لین دین کس حد تک ممکن ہے؟ کیا صرف متون کے مفہوم کی ترسیل کافی ہے یا پھر بین المتون پوشیدہ مفاہیم کا انتقال بھی لازمی ہے! ان سب باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہرین نے اس کی الگ الگ تعریف کی ہے۔ پروفیسر

ظہوالدین نے اپنی کتاب فن ترجمہ نگاری میں این آر شاستری کے ایک اقتباس سے جو تعریف اخذ کی ہے وہ نہایت موزوں معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں

> "بنیادی زبان (S.L) میں جس عمل نے ایک متن کا روپ اختیار کیا ہے اس کو اپنے سارے انسلاکات کے ساتھ ترجمے کی زبان (T.L) میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔"(۱)

اس تعریف میں بنیادی زبان (جسے انگریزی میں Target Language کہا جاتا ہے) کے الفاظ کا ترجمے کی زبان (جسے انگریزی میں Source Language کہا جاتا ہے) میں متبادل تلاش کرنے کو کافی نہیں سمجھا گیا ہے بلکہ لفظ "انسلاکات" سے ان تمام چیزوں کا احاطہ کیا گیا ہے جو بنیادی زبان کے متن میں پوشیدہ ہوں۔ ایسی صورت میں ترجمہ کرنے کی دو شکلیں سامنے آتی ہیں جسے وینکٹیشور شاستری نے دو قسمیں کہہ کر متعارف کرایا ہے۔

Semantic Translation یعنی مفہومیاتی ترجمہ

Communicative Translation یعنی ترسیلی ترجمہ

مفہومیاتی ترجمہ میں بنیادی متن کے سیاقی مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے اصلی متن کے جملوں کی ساخت کو قائم رکھا جاتا ہے۔ اس طرح کے ترجمہ میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ بنیادی متن کے مفہوم کو ترجمے کی زبان میں بہتر سے بہتر طور پر واضح کیا جائے اسی لئے اکثر یہ وضاحت بہت سے متعلقہ مفاہیم کو بھی اس ترجمہ میں شامل کر لیتی ہے۔ اس طرح ترجمہ خاصہ پر مغز، پیچیدہ اور تفصیلی ہوجاتا ہے جس میں خیال کی عکاسی تو نظر آتی ہے مگر الفاظ اور ادیب کی منشا زائل ہوجاتی ہے۔

ترسیلی ترجمہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے پروفیسر ظہور الدین نے اپنی کتاب میں وینکٹیشور شاستری کے مضمون سے چند نکات بیان کئے ہیں جن سے ترسیلی ترجمہ کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

☆ اس طرح کا ترجمہ (ترسیلی ترجمہ) اسی طرح کا اثر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے جیسا سورس لنگویج کے قارئین پر پڑا ہوتا ہے۔

☆ یہ ترجمہ اتنا سادہ، آسان اور براہ راست ہوتا ہے کہ ٹارگٹ لنگویج کے قارئین اس کی زبان، کلچر، جذباتی اقدار اور کبھی کبھی نئے نظریات کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔

☆ یہ موضوع پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اس کی قوت سے ہی تشفی پاتا ہے۔

☆ یہ اصلی متن کے موضوع، خیال اور تمدنی پہلوؤں کو قاری سے قریب کر دیتا ہے۔

☆ ترسیلی ترجمہ کام چلاؤ (Functional) ہوتا ہے یعنی زاویہ نظر کے اعتبار سے سماجی ہوتا ہے۔

☆ ترسیلی ترجمہ لازماً افہام و تفہیم اور قاری کے ردِّ عمل پر توجہ دیتا ہے۔

ان اشاروں سے محسوس ہوتا ہے کہ ترسیلی ترجمہ میں اصل متن سے ظاہر ہونے والی باتوں کو ترجمے کرنے والی زبان میں منتقل کر دیا جاتا ہے، یہاں مفہوم کی گیرائی سے زیادہ تعلق نہیں رہتا۔ تبھی اسے "کام چلاؤ" ترجمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر مختصراً کہا جائے تو مفہومیاتی ترجمہ میں سارا زور مفہوم کے ابلاغ کی طرف دیا جاتا ہے لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا جاتا ہے اور ترسیلی ترجمہ میں سرسری طور پر اصل متن سے جو معنی اخذ کئے جا رہے ہوں انھیں بیان کر دیا جاتا ہے۔

ماہرین نے ترجموں کی جو قسمیں کی ہیں ان میں علمی ترجمہ جس میں سائنسی یا دیگر علمی تحریریں شامل ہیں۔ اس ترجمہ کا سارا زور ترسیل معنی اور مفہوم پر ہوتا ہے۔ ادبی ترجمہ اس ضمن میں وہ ترجمہ آتا ہے جسے مترجم ٹارگٹ زبان کے ادبی تقاضوں کے مدنظر کرے یعنی جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اس کے محاورات، تشبیہات و استعارات سے عبارت میں حسن پیدا کر دے۔ ان ترجموں میں جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلا لفظی ترجمہ یہ زیادہ دستاویزات کی منتقلی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرا آزاد ترجمہ اس میں الفاظ اور خیالات کی ترتیب کا لحاظ رکھا جاتا ہے مگر لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا جاتا ہے۔ تیسرا اور آخری تخلیقی ترجمہ کہلاتا ہے جس میں اصل متن کا مفہوم ٹارگٹ لنگویج کی ادبیت میں اس طرح "حل" ہو جاتا ہے کہ اس پر ترجمہ سے زیادہ تخلیق کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اردو زبان میں اس کی عمدہ مثالوں کے طور پر "سب رس" یا "باغ و بہار" داستانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام صورتوں میں ایک مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصل متن کی زبان یعنی ٹارگیٹ لینگویج اور ترجمہ کرنے والی زبان یعنی سورس لنگویج سے اس طرح واقف ہو کہ محاورے، تشبیہیں اور استعاروں کے علاوہ اس زبان کے لسانی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کو بھی خوب سمجھتا ہو۔ یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب ترجمہ

ایک ایسی زبان میں کیا جائے جو سورس لنگویج سے بالکل مختلف ہو یعنی اس کی ہم اصل نہ ہو۔ ہم اصل ان زبانوں کو کہا جاتا ہے جو ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جیسے ہند ایرانی، ہند آریائی، ہند یوروپین زبانیں وغیرہ۔ اسے انگریزی میں Cognate Languages بھی کہا جاتا ہے۔ ہم اصل زبانوں میں آپسی لسانی تعلقات کی بنا پر تشبیہات، استعارات، محاورات اور ثقافت وتہذیب کا مختصر سا ذخیرہ مشترک ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے ترجمہ کرنے اور مفہوم کے ابلاغ وترسیل میں آسانی ہوتی ہے۔ محمد حسن اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں

> ''نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں۔ اور قدیم وجدید زبانیں اپنی ہمعصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں یہ عمل تاریخ، تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے۔''(۲)

اسی لئے جتنا سہولت کے ساتھ بہتر ترجمہ ہندی کا اردو میں ہوسکتا ہے اتنا لاطینی یا یونانی زبان میں ممکن نہیں اور یہ پریشانی بھی ایسے متن کے ساتھ ہوتی ہے جہاں معاملہ جذبات وتہذیب کے اظہار کا زیادہ ہو۔ کیونکہ کسی معلوماتی علوم کے ترجمہ میں نہ تو معنی کی تہہ داری ہوتی ہے کہ ایک ایک لفظ اپنے اندر کئی کئی جہات لئے ہو اور پھر یہاں اسی زبان کی اصطلاح کا استعمال بھی ممکن ہوتا ہے بعد میں جس کی وضاحت اپنے الفاظ میں کر دی جاتی ہے۔ لیکن ادب کے معاملہ میں یہ مسئلہ کافی دقت طلب ہے۔

ادب میں کہی جانے والی بات کے پہلو میں مصنف کا منشا بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ یہ منشا نہ تو صاف طور پر عیاں ہوتا ہے اور نہ ہی متون کے الفاظ کھلے طور پر اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بلکہ چند اشارے اور تحریر کی مجموعی فضا قاری کو منشائے مصنف کی طرف لے جاتی ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ پوری تحریر مکمل ہونے کے بعد بھی قاری مصنف کے نقطہ نظر تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس کی مثال میں بلراج مینرا، قمراحسن، اقبال مجید اور جوگیندر پال وغیرہ کے بعض افسانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن میں منشائے مصنف کا پتہ متن کے الفاظ کے ذریعہ نہیں لگایا جا سکتا بلکہ تحریر کی مجموعی فضا اور اس میں باریک اشاروں کو سمجھنا ہوگا۔ فن ترجمہ نگاری میں یہ مسئلہ سمجھانے کے لئے اقبال کے ایک شعر کی مدد لی گئی ہے یہاں اس کا ذکر مفہوم کو مزید واضح کر دے گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

کوئی ترجمہ نگار اس کے سیدھے سادے معنی اس طرح متعین کر سکتا ہے کہ پھول کی پتی سے تو ہیرے کا جگر

کاٹا جاسکتا ہے پر کسی نادان شخص پر نرم و نازک کلام کا اثر نہیں ہوسکتا۔کوئی دوسرا ترجمہ نگار اس کا مفہوم یوں پیش کرسکتا ہے کہ کیا پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹ سکتا ہے؟ نہیں نا! جس طرح یہ ناممکن ہے اسی طرح کسی نادان شخص کو پیار و محبت سے راہ راست پر نہیں لایا جاسکتا۔کوئی تیسرا ترجمہ نگار ہوسکتا ہے اس کے معنی یوں متعین کرے کہ جس طرح ہیرے کو ہیرے سے ہی کاٹا جاسکتا ہے اسی طرح نادان کو سمجھانے کے لئے خود نادان بننا پڑتا ہے۔ایسی صورت حال میں مترجم کے لئے لازمی ہے کہ وہ دیانتداری کے ساتھ جتنا ممکن ہو اصل متن کو ترجمے کی زبان میں واضح کرنے کے بعد ممکنہ مفاہیم کی تشریح قوسین یا پھر حاشیہ پر لکھ دے تاکہ قاری اپنے ذہنی وفکری سطح کے اعتبار سے تحریر سے مستفید ہوسکے۔

ان تمام دشواریوں سے گذر کر ایک ترجمہ نگار کسی تحریر کو ٹارگیٹ لنگویج میں منتقل کرتا ہے۔اسی لئے ترجمہ کو "تخلیق نو" Re Creation سے تعبیر کیا جاتا ہے۔مگر یہ بھی نہایت نازک مرحلہ ہوتا ہے اگر ترجمہ میں تخلیقیت کا عمل بڑھ جائے تو اسے اصل متن سے مطابقت دینا مشکل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک قاری کسی تحریر کا ترجمہ اس نیت سے پڑھتا ہے کہ وہ منشائے مصنف سمیت،اصل متن کے معنی و مفہوم سے استفادہ کرنا چاہتا ہے۔اس حوالے سے ترجمہ کا فن اور روایت کے مقدمہ میں قمر رئیس ڈاکٹر جانسن کا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> "ڈاکٹر جانسن نے مدتوں پہلے جو بات کہی تھی اسے آج عالمی سطح پر تسلیم کیا جارہا ہے کہ ترجمہ کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کسی طرح مستحسن نہیں۔مترجم کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ کسی تصنیف کی معنوی یا فنی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنی یا ترجمہ کی زبان میں پوری دیانت داری سے منتقل کرنے کی کوشش کرے۔" (۳)

اس قول میں ترجمہ میں کرنے اصل متن کی حقیقت کو محفوظ رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔لیکن یہ قول آیۂ سبحانی کی طرح مکمل نہیں کہ جس پر اعتراض نہ کیا جاسکے۔ اگر مترجم کو بالکل جکڑ کر یا پھر اصل متن کے حصار میں قید رکھا جائے گا تو ایک اچھے ترجمہ کے امکانات ختم ہوجائیں گے اس لئے مترجم کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ وہ بہترین ترجمہ کے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کرسکے اگر چہ یہ مظاہرہ مترجم کی نہیں بلکہ مصنف کی ترجمانی کرتا ہو۔مثال کے طور پر میریڈتھ (Meridith) کی نظم The Young Usurper کا ترجمہ عظمت خان نے "ننھا غاصب" کے نام سے گیا۔اس نظم کی پہلی دو سطروں کا ترجمہ دیکھئے

مرے گھر کی دیوی کے بالائے سینہ

کھلا ہے محبت کا تازہ کنول

اس کی اصل لائن ہیں

The young usurper

On my darling's bosom

اس ترجمہ میں عظمت خان نے Darling کے لفظ کی جگہ دیوی کا لفظ رکھا حالانکہ عام طور پر اس لفظ کے لئے اردو میں محبوبہ، پیاری، جان من وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں مگر چونکہ نظم میں ایک ایسے بچے کی بات کی جارہی ہے جس کو فرشتہ قرار دیا گیا ہے لہٰذا یہاں پر لفظ کے لغوی ترجمہ سے انحراف کرتے ہوئے مترجم نے اپنے فنکارانہ انداز کا مظاہرہ کیا ہے جو غیر مستحسن ہرگز نہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ میں بنیادی متن کے الفاظ اور افکار کی ترتیب کا خیال رکھا جائے غیر ضروری طور پر اس سے چھیڑ چھاڑ جائز نہیں۔ جیسا کہ ضمانتی اور عدالتی دستاویزات میں ان باتوں کا خیال رکھنا اولین شرط قرار دیا گیا ہے۔

ترقی یافتہ دور میں ترجمہ نے بھی اپنا طریقہ کار بدلا ہے۔ اب ترجمہ کے لئے بہت سے مشینیں اور سوفٹ ویئر وغیرہ ایجاد ہو چکے ہیں اور یونیورسٹیز میں اس کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کیا جا چکا ہے جس میں ترجمے کے مسائل اور بہتری پر تحقیقی کام جاری ہے۔ آج ترجمہ کی اہمیت اور افادیت بجائے خود ایک روشن حقیقت بن چکا ہے۔ شہباز حسین اپنے مضمون ترجمہ کی اہمیت میں لکھتے ہیں

> "علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم وفنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اسی لئے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پالیا ہے۔" (۴)

علوم کی ترقی اور خیالات کی ترسیل نے ترجمے کی روایت کو استحکام بخشا ہے۔ لوگوں کو "جاننے" کے اشتیاق اور علمی میدان میں کامرانی کی چاہت نے ہر زبان کی معلوماتی تحریروں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ یہ روایت مزید مستحکم ہوتی رہے گی کیونکہ علم زمانے کی رفتار کے ساتھ خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہے لہٰذا ترجمہ کی مقبولیت کا کارواں بھی یوں ہی رواں دواں رہے گا۔

☆اردو میں ترجمہ کی روایت

کسی بھی زبان میں باقاعدگی کے ساتھ دیگر علوم کی منتقلی کا سلسلہ خود اس زبان کی مقبولیت اور استواریت پر منحصر ہوتا ہے۔ چونکہ اردو زبان اپنے ابتدائی زمانے میں کسمپرسی کے عالم رہی اور 14 ویں صدی عیسوی کے آخر سے باقاعدہ طور پر صوفیائے کرام نے اس زبان کو وسیلہ اظہار بنایا اس لئے اردو زبان کی لسانی تشکیل، ادبی تخلیقات اور ترجمہ کے نمونے 15 ویں صدی کے بعد سے ملتے ہیں۔ زیادہ تر مورخین و محققین کے مطابق اردو میں سب سے پہلی ترجمہ کی ہوئی تصنیف" شرح تمہیدات ہمدانی" ہے۔ اصل کتاب یعنی" تمہیدات ہمدانی" ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ہے۔ نثار احمد کے مطابق

"اس ترجمہ کا ایک نسخہ ۱۶۰۲ میں لکھا گیا" (۵)

دوسری مقبول ترین کتاب" سب رس" ہے جو مشہور قول کے مطابق شاہ جی نیشا پوری کی تصنیف دستار عشاق کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم ملا وجہی ہیں۔ اس کتاب کو اردو کے داستانوی ادب میں اولیت حاصل ہے۔ یہ کتاب 1635 میں مکمل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دکن میں اردو کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں اور قطب شاہی و عادل شاہی حکومت کی سرپرستی علماء و ادبا کو حاصل تھی۔ علما اپنے بزرگوں کی تصانیف دیسی زبان میں منتقل کر رہے تھے اور ادیب قدیم فارسی و عربی متون کو بنیاد بنا کر اپنی کتابیں تخلیق کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ ترجمہ اس نوعیت کے نہیں تھے کہ انھیں نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکے کیونکہ ان میں نہ تو الفاظ کی ترتیب کا خیال کیا جاتا اور نہ ہی اصل متن کی ساخت کا لحاظ رکھ کر جملوں کا انتخاب ہوتا بلکہ مترجم کتاب کے مجموعی مفہوم کو مرکز بنا کر اپنے خیالات اور من پسند الفاظ کے ساتھ اردو زبان میں پیش کر دیتا۔ ان نمونوں میں شمائل الاتقیاء، طوطی نامہ، معرفت السلوک وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ فارسی کی ایسی ہی ایک کتاب روضۃ الشہدا کو شمالی ہند کے ایک بزرگ فضل علی فضلی نے کربل کتھا کے نام سے ترجمہ کیا اور واقعہ کربلا کو پہلی بار اردو کی نثری شکل میں پیش کیا۔ یہ زمانہ 18 ویں صدی کا تھا اور اب اردو زبان نے اپنی جڑیں دکن سے شمالی ہند تک پھیلا لی تھیں۔ اسکی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا لہٰذا طبعزاد تصانیف کے پہلو بہ پہلو تراجم کا کارواں بھی رواں دواں تھا۔ اسی زمانے میں عیسائیوں نے تبلیغ دین کی نیت سے اپنی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا اور 18 ویں صدی کے وسط میں توریت و انجیل کے ترجمہ شائع ہوئے۔ شہباز حسین

اس ترجمہ کو انگریزی سے اردو میں ہونے والی پہلی کتاب قرار دیتے ہیں۔

"انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب شلز کی "انجیل مقدس" ہے جو 1747 میں شائع ہوئی۔"(۶)

اسی دور میں شاہ رفیع الدین اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالقادر نے قرآن کریم کو اردو نثر میں منتقل کیا۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ لفظی تھا اس لئے اسے وہ مقبولیت نہیں ملی جو ان کے چھوٹے بھائی عبدالقادر کے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کو حاصل ہوئی۔ انیسویں صدی کا آغاز تلخ و شیریں واقعات سے ہوا۔ انگریزوں نے اپنے سب سے بڑے دشمن ٹیپو سلطان کو دھوکے سے شکست دے دی اور ہندوستان پر بلا روک ٹوک حکومت کرنے کا منصوبہ بنانے لگے۔ اس منصوبہ میں یہاں کی دیسی زبان میں علوم کی فراہمی اور اس زبان سے انگریزوں کی آشنائی بھی شامل تھا۔ لہٰذا منظم طور پر ترجمہ کا آغاز 19 ویں صدی کے ساتھ شروع ہوگیا۔ اس بابت قمر رئیس کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں انھوں نے 19 ویں صدی میں ترجمہ کی پیش رفت کو کتنا جامع انداز میں پیش کیا ہے

"۔۔۔ ان ترجموں کا آغاز یوں تو مشنری اداروں اور بعض افراد کے ہاتھوں اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہوگیا تھا لیکن اس کی رفتار و معیار میں تیزی اور نتیجہ خیزی انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی پیدا ہوئی۔ جہاں تک انگریزی سے ترجمہ کا تعلق ہے فورٹ ولیم کالج کا کارنامہ صرف چند لغات کی تدوین تک محدود ہے یا پھر چند کہانیوں اور ڈراموں کے اقتباسات کے ترجمے ہیں جو جان گلکرسٹ نے نمونے کے طور پر کئے یا کرائے تھے۔ دلی کالج میں اس کے پرنسپل بوترو کی رہنمائی میں ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام 1841 میں عمل میں آیا۔ لیکن اس سے تیس سال قبل حیدرآباد میں نواب فخر الدین خاں شمس الامرا ثانی سائنسی علوم کے انگریزی رسائل کے ترجمہ اور طباعت کا انتظام کرا چکے تھے۔"(۷)

نواب فخر الدین خاں شمس الامرا ثانی نے 1834 میں انفرادی طور پر دارالترجمہ قائم کیا تھا جس کی کتابیں ان کے سنگی چھاپے خانے میں چھپتی تھیں۔ ان کے یہاں رسالہ علم ہیئت، رسالہ علم ہوا، رسالہ علم جرّ ثقیل، رسالہ علم انظار وغیرہ اشاعت پذیر ہوئے۔

اس صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم اور دہلی کالج کی مدد سے اردو میں تراجم کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ فورٹ ولیم کالج (1800 عیسوی) کا قیام ہندوستانی زبان سکھانے کے لئے کیا گیا تھا جس میں اردو زبان کو کافی اہمیت دی گئی جس کے لئے جان گلکرسٹ کی نگرانی میں اردو شعبہ قائم ہوا۔ جان گلکرسٹ نے سب سے پہلے کتاب کی فراہمی کے لئے دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرائے، نصابی کتابیں تیار کی گئیں۔ فوٹ ولیم کالج کے ذریعہ لازوال ترجمہ اردو ادب کو ملے۔ جن میں میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی توتا کہانی، میر شیر علی افسوس کی باغ اردو اور آرائش محفل، مرزا کاظم علی کی شکنتلا، خلیل علی خان اشک کی داستان امیر حمزہ، نہال چند لاہوری کی مذہب عشق وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

دہلی کالج کی بنیاد مدرسہ کی شکل میں تو 1792 میں ہی استوار ہو چکی تھی مگر یہاں ترجموں کا کام تیس سال بعد شروع ہوا جب یہ 1825 میں دہلی کالج بن گیا اور ہندوستانی طلبہ میں مغربی علوم کو عام کرنا اس کالج کا مقصد قرار پایا۔ نصاب کی کتابوں کی فراہمی کے لئے ایک "ایجوکیشنل کمیٹی" قائم کی گئی جس کے تحت دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی بنیاد پڑی جس نے کتابوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے باقاعدگی کے ساتھ تراجم کا کام شروع کرایا۔ چونکہ یہاں مغربی علوم مثلاً کیمسٹری، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کے ترجمے ہونے تھے جو کہ کافی مشکل کام تھا، لہٰذا دہلی کالج نے پہلی دفعہ مترجمین کے لئے بعض اصول متعین کئے جس کی مدد سے ترجموں کو بہتر بنایا جا سکے۔ "اردو ذریعہ تعلیم" کے رواج کی بنیاد اسی کالج سے پڑی اور ساتھ ہی سائنسی ترجمہ کی شروعات بھی اسی کالج کی مرہون منت ہے۔ اس کالج نے جن کتابوں کے تراجم اردو ادب کو دئے ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ تحریر اقلیدس مقالہ، اصول قانون، تاریخ ہند زمانہ قدیم سے تا زمانہ حال، اصول حکومت، اصول قوانین مال گزاری، اصول قوانین اقوام، تاریخ انگلستان، خلاصی تاریخ گولڈسمتھ کا ترجمہ، الجبر ترجمہ برجز، علم مثلث و تراش ہائے مخروطی، عملی علم ہندسہ "پریکٹیکل جیومیٹری"، اصول علم ہیئت ترجمہ علم ہیئت، تاریخ اسلام، تاریخ یونان، تاریخ رومان، رسالہ کیمسٹری ترجمہ پارکر، استعمال آلات ریاضی، اٹلس جغرافیہ، قواعد اردو، انتخاب الف لیلہ، شمیسہ منطق میں، قانون محمدی فوج داری ترجمہ کتان میکنائن، اردو لغات، لیلاوتی حساب، رامائن، نل دمن، مہا بھارت انتخاب، تحلیلی علم ہندسہ، محاورات اردو اور ترجمہ تزک تیموری وغیرہ۔

اس کالج کے بعد اردو میں سائنسی علوم کی منتقلی کے لئے بہت سے ادارے قائم ہوئے جن میں سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی (1864) نے غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ سرسید ہمیشہ سے مسلمانوں میں مغربی علوم کے تئیں بیداری لانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں اور تقریریں بھی کیں۔ مگر مسئلہ یہاں بھی

کتاب کی عدم موجودگی کا تھا لہٰذا انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اس سوسائٹی کے تحت انگریزی کی علمی، تاریخی وسائنسی کتابیں اردو میں ترجمہ کروا کر شائع کی جائیں گی۔ تاکہ مغربی علوم وفنون کی طرف اہل وطن مائل ہوں۔ مرزا حامد بیگ کے مطابق

"سوسائٹی نے غازی پور میں ہی ترجمہ کا کام باضابطہ طور پر شروع کر دیا تھا اور محض ایک سال کی قلیل مدت میں (1865ء تک) آٹھ تراجم سید احمد خان کے نجی چھاپے خانے سے چھپ کر شائع ہوئے۔" (۸)

یہ تراجم صرف نثر پاروں تک محدود نہیں تھے بلکہ زبان کی وسعت اور ترقی کے باعث اب نظموں کے بھی ترجمہ کئے جانے لگے تھے چنانچہ اردو میں منتخب انگریزی نظموں کا پہلا مجموعہ "جواہر منظوم" کے نام سے قلق میرٹھی نے 1864 میں جب کہ دوسرا مجموعہ منتخب انگریزی نظموں میں منظوم تراجم کے نام سے بانکے بہاری لال نے 1869 میں کیا۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، نظم طباطبائی، نادر کاکوری، اسماعیل میرٹھی، سرور جہاں آبادی وغیرہ نے اس تراجم کی روایت کو آگے بڑھایا۔

بیسویں صدی تک اردو اپنے دامن میں ترجمہ کا اچھا خاصہ ذخیرہ سمیٹ چکی تھی۔ قصہ کہانیوں کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی کتابیں اردو کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ اس روشن مستقبل کو مزید ضیابار بنانے کے لئے مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو ہند (1903) کے زیر انتظام مستعدی کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ حالی جانتے تھے کہ مسلمانوں کی ترقی تبھی ممکن ہے جب تمام علوم وفنون ان کی زبان میں دستیاب ہوں۔ اسی لئے انھوں نے قدیم روایت کے مطابق علوم جدیدہ کے ذریعہ اردو زبان کی ثروتمندی میں اضافے کرتے رہے۔ 1913 میں جب مولوی عبدالحق معتمد مقرر ہوئے تو اس رفتار میں تیزی آگئی اور انجمن نے اردو میں بہت سی کتابوں کے ترجموں کی اشاعت کو یقینی بنایا مثلاً خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا اردو ترجمہ "فلسفہ تعلیم" کے عنوان سے کیا۔ ایبٹ کی تصنیف "نپولین بونا پارٹ" کا بھی اردو میں ترجمہ ہوا جو پانچ جلدوں میں شائع ہوا۔ مولانا الحکیم محمد حسن فاروقی نے "القول الاظہر" کے نام سے علامہ ابن مسکویہ کی عربی تصنیف رسالہ فلسفۂ الٰہیات الفوز الاصغر کا اردو میں ترجم کیا۔ ہسٹری آف پرشین لٹریچر کو سید سجاد حسین نے تاریخ ادبیات ایران کے نام سے شائع کیا۔ افلاطون کی ریپبلک کو ریاست کے نام سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے متعارف کرایا۔ خطبات گارساں دتاسی کو ڈاکٹر یوسف حسن نے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اس تنظیم نے اردو میں

نصاب کی کتابوں کی نافراہمی کوکافی حدتک ختم توضرورکردیاتھامگراتنانہیں کہ اردوزبان کوذریعہ تعلیم بنالیاجائے اس کے لئےعثمانیہ یونیورسٹی میں دارلترجمہ کاقیام ہوناضروری تھا۔

1917 میں عثمایہ یونیورسٹی کاقیام ہواجس کامقصدتھاکہ اردوکوذریعہ بناکرتمام علوم کی تعلیم دی جائے ظاہر ہے کہ یہ منصوبہ دیگرتمام منصوبہ سے کہیں بڑاتھااور یہاں درسی کتابوں کی نوعیت بھی دوسری تھی کیونکہ اب طلبہ کو باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کی ضرورت تھی اورایک فن پردوچارکتابوں سے کام چلنے والانہیں تھا۔اس لئے یونیورسٹی میں جس شعبہ کویہ کام سونپاگیاتھایعنی دارالترجمہ اس نے تنخواہ پرمترجمین کی تقرری کی اورطب،حیاتیات،نفسیات، طبیعات،کیمیااورانجینئرنگ وغیرہ کےفن کی کتابیں اردوزبان میں منتقل کرائی۔اس شعبہ کاامتیازیہ تھااس نے وضع اصطلاحات کمیٹی قائم کی تھی جس میں نئی نئی علمی اصطلاحیں وضع کی گئیں جس کے سبب اردوزبان ایک Rich Launguage بن گئی۔ان اصطلاحوں کے استعمال کے لیےفن سے واقف اشخاص کورکھاگیا۔جن میں وحیدالدین سلیم،مولوی عبدالحق،نظم طباطبائی،مرزاہادی رسواوغیرہ کانام قابل ذکر ہے۔دارالترجمہ عثمانیہ کے سائنسی مترجمین میں چودھری برکت علی،قاضی تلمذحسین،خلیل الرحمن،محمدعبدالرحمن خان،مفتی شاہنواز،شیخ فیروز الدین مراد،محمدحسین،محمدنعمت اللہ،محمدنصیرالدین عثمانی،محمدعظمت اللہ،عبدالباری ندوی،محمدسعیدالدین،محمداشرف،ضیاء الدین انصاری،سیدہاشمی فریدآبادی،کرنل فرحت علی،ڈاکٹرغلام دستگیر،حکیم محمدیوسف،حکیم غلام جیلانی اورحکیم کبیر الدین وغیرکےنام بھی شامل ہیں۔شہبازحسین اپنےمضمون ترجمہ کی اہمیت میں لکھتے ہیں

> ”دراصل اردو میں سب سے منظم اور باضابطہ کوشش جامعہ عثمانیہ کے قیام (۱۹۱۷) کے بعدشروع ہوئی۔کیونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعہ تعلیم اردوکوقراردیا تھا۔جامعہ عثمانیہ میں”سررشتہ تعلیم وترجمہ“ قائم ہواجس کےتحت ۵۰۰ کےقریب کتابیں ترجمہ ہوئیں یہ کتابیں آرٹس اورسائنس،انجیرنگ اورمیڈیسن تقریباً تمام جدیدعلوم پرحاوی تھیں ہندوستان کی کسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کایہ پہلا تجربہ تھاجوبحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔“،(۹)

1948 میں تعصب کی آگ نے دارلترجمہ کی ان بیش بہاکتابوں کوبھی خاکستر بنادیااور 1950 میں یونیورسٹی کاذریعہ تعلیم انگریزی ہوگیا۔

اردوترجمہ کی روایت بیسویں صدی کےنصف آخرتک ترقی کے کئی منازل طے کرچکی تھی۔کئی اکادمیاں کا

قیام عمل میں آچکا تھا بہت سی کتابیں انفرادی طور پر ترجمہ کی جانے لگی تھیں اور بہت سی تنظیمیں ترجمہ نگاری کو فروغ دینے کے لئے اعزاز بھی تقسیم کرنے لگی تھیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب ترجموں کی نوعیت بہت بدل چکی تھی اس کے اصول مرتب کئے جاچکے تھے۔اس میں سائنٹفک نظام کو اپنایا جانے لگا تھا۔سید احتشام حسین لکھتے ہیں

> "۔۔۔1930 کے قریب کئی اچھے لکھنے والے با قاعدہ افسانوں کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے اور یہی نہیں کہ انھیں جوملا اس کا ترجمہ کرلیا بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں کے اچھے افسانوں کی جانب نگاہ گئی ان مترجمین میں خواجہ منظور حسین، حامد علی خاں، جلیل قدوائی، محشر بدایونی، فضل حق قریشی، اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار، مجنون گورکھپوری ، اعظم کریوی نے روسی، فرانسیسی، جرمنی انگریزی اور انگریزی کے ذریعے، دوسری زبانوں کے افسانے ترجمہ کے لئے منتخب کئے۔"(۱۰)

ترجمہ کے اس کارواں میں سستی ضرور آئی ہے اس کی وجہ ترجمہ نگار کی ناپیدی نہیں بلکہ زبان کے تئیں عدم توجہی ہے۔ترجمہ کی رفتار اردو زبان کی مقبولیت پر منحصر ہے جتنا زبان کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اس کے دامن میں دیگر علوم وفنون اپنی جگہ خود بخود بناتے چلے جائیں گے۔

☆عابد سہیل کی ترجمہ نگاری

بیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ آج کے ڈجیٹل انقلاب سے کوسوں دور تھا۔اس وقت نہ تو انگلیوں کی جنبش پر دنیا بھر کی لائبریری سے استفادہ ممکن تھا اور نہ ہی ایک "ٹچ" کی مدد سے معلومات جمع کی جاسکتی تھی۔لوگ سیر و تفریح اور وقت گذاری کے لئے یوٹیوب اور فیس بک نہیں چلاتے تھے بلکہ شرفا اکثر کتب بینی یا دیگر تحریری کاموں میں مشغول رہتے۔یہی وجہ تھی کہ اس وقت کتابیں چھپتی بھی بڑے اہتمام سے تھیں اور بکتی بھی خوب تھیں۔ ان میں بھی جاسوسی ناول اور دلچسپ ڈراموں وغیرہ کی کتابیں زیادہ پسند کی جاتیں۔کئی ناول نگار اتنے مقبول ہوتے کہ ان کی تصنیفات بازار میں آتے ہی "ہاٹ کیک" کی طرح غائب ہوجاتیں جیسے ابن صفی وغیرہ۔ان دنوں جاسوسی ناولوں کی مقبولیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ پبلشرز بھی ایسی ہی ناولیں شائع کرنے کی فکر میں زیادہ رہتے کیونکہ یہ سب آسانی سے فروخت ہوجاتیں۔ناولوں کی مقبولیت کو مزید واضح کرتا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجئے

> "بات کم و بیش ساٹھ سال پرانی ہے، یعنی 1955 کے آس پاس کی۔وہ زمانہ جاسوسی ناولوں اور معمّوں کی مقبولیت کا تھا اور شمالی ہندوستان کے تقریباً ہر شہر اور گھنی آبادیوں کی بیشتر گلیوں کے نکڑوں پر چھوٹی دکانیں ہوتیں جہاں ادبی اور نیم ادبی اور جاسوسی ناولیں کرائے پر بھی دستیاب ہوجاتیں، معمّوں کے حل جمع کئے جاتے اور ان کے ایک ایک لفظ کی مناسبت اور عدم مناسبت پر بحثیں ہوتیں۔اس علاقہ کے ہر شہر میں دو تین ناشرین کتب ہوتے جو زیادہ تر جاسوسی ناولیں چھاپتے۔دہلی میں تو اس طرح کے اداروں کی تعداد بیس پچیس ضرور رہی ہوگی۔"(۱۱)

اس کاروبار سے تخلیقی ادب کو بڑا فادہ ہوا اس میں بیش قیمتی اضافہ ہوئے اور نئے نئے ناول اور ڈرامے لکھے جانے لگے۔کچھ پبلشر نے یہ سوچ کر کہ کہیں عوام ایک جیسے ناول پڑھ کر اوب نہ جائے اور فروخت کا یہ سلسلہ تھمنے نہ لگے، دیگر زبانوں کے ناول کا ترجمہ کرانا شروع کر دیا۔ترجمے کئے ہوئے یہ ناول ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔پبلشر کی آمدنی بھی ہوتی اور مترجم کو بھی اچھی رقم مل جاتی۔لکھنؤ میں اس وقت اردو کتابوں کے اشاعتی کاروبار میں کتابی دنیا کافی آگے تھا اور یہ اچھے خاصے ناول چھاپ چکا تھا۔دیگر زبانوں کے ترجموں کا کام بھی یہاں بڑی تیزی کے ساتھ

ہو رہا تھا۔اس ادارہ کے لئے ترجمہ زیادہ تر انور مسعود یا مسعود انور کرتے۔مگر یہ ترجمے زیادہ دنوں تک اپنی مقبولیت باقی نہیں رکھ سکے کیونکہ ان میں اردو ناول کی طرح اپنے دیس کی مٹی کی خوشبو نہیں تھی۔اس کمی کو سلامت علی مہدی سمجھ گئے تھے اور ایک دن انھوں نے کتابی دنیا کے مالک اظہر نگرامی سے کہا

> ”لندن، گلاسگو، نیو یارک او لافرڈ، جیمس اور جانسن کے مقابلے میں پڑھنے والوں کو اپنے ملک کے لوگ، شہر اور ماحول زیادہ پسند آتے ہیں اور وہ ان سے اپنائیت آسانی سے قائم کر لیتے ہیں“(۱۲)

اظہر نگرامی کو بات سمجھ میں آ گئی اور پھر بیرونی ناول ہندوستانی رنگ میں پیش کئے جانے لگے۔اس کام کو کرنے کے لئے عابد سہیل کا بھی انتخاب ہوا اور اس طرح عابد سہیل نے باقاعدگی کے ساتھ ترجمہ نگاری میں قدم رکھا۔ڈیڑھ پونے دو سو صفحات پر مشتمل بہت سے ناولوں کے ترجمے عابد سہیل نے کئے لیکن یہ سارے کے سارے فرضی نام سے شائع ہوئے۔سب سے پہلا ترجمہ جوان کے نام سے شائع ہوا وہ ایڈگر ویلیس کا ناول تھا جو 1957 میں ”سبز بھوت“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔یہ کتاب انھوں نے اپنے نام سے کیوں شائع کرائی اس بارے میں اپنی خودنوشت میں ایک جگہ لکھتے ہیں

> ”کئی ماہ پہلے منظر بھائی نے ایک دن حلیم خاں کے یہاں میرے کمرے میں بید کی ایک الماری میں سلیقے سے سجی ہوئی دس بیس کتابیں اور بستر پر دو چار ادبی پرچے دیکھ کر کہا تھا،” آپ ادیبوں کی طرح رہنے سہنے لگے، مگر۔۔۔“ اس کے بعد کے الفاظ یاد نہیں لیکن مطلب اس کا یہ تھا کہ ادیب نہ بن پائے۔ان کی بات میں نے ذرا بھی برا نہ مانا تھا۔۔۔۔مگر دل پر ایک بوجھ سا ضرور بیٹھ گیا تھا۔ممکن ہے کتاب اپنے نام سے چھپوانے کا محرک یہی بوجھ رہا ہو۔“(۱۳)

اس اشاعت کے بعد عابد سہیل کو ادیب بننے کا احساس ہونے لگا اور یہ ”فخر یابی“ انھیں ایک اور ناول کی اشاعت پر آمادہ کرنے لگی۔جس کے نتیجہ میں ”سرخ انگلیاں“ نام کا ناول وجود میں آیا۔

حالانکہ 26 جنوری 1950 سے قبل عابد سہیل تین چار بنگالی کہانیاں (جو انگریزی میں تھیں) کا ترجمہ کر چکے تھے اور بقول مصنف

> ”ان میں سے ایک ترجمہ پاکستان کے ”ماہ نو“ میں شائع ہوا تھا اور اس کا معاوضہ

مجھے بذریعہ منی آرڈر ملا تھا۔"(۱۴)

یہ افسانہ بدھ دیو بوس کا تھا اور انگریزی میں An Intricate Affair کے نام سے شائع ہوا تھا۔ شروعاتی دور میں عابد سہیل نے اپنے نام کے بجائے اپنے شاگردوں کے نام سے ہی تراجم کئے تھے جس میں نصر اللہ خاں، ان کے بڑے بھائی آزاد حمید اور عزت جمال وغیرہ کے نام شامل ہیں۔اس وقت ترجمہ کا طریقہ کار الگ ہوتا۔ پہلے ناول میں آنے والے مقام اور کردار کو ہندوستانی مقام اور کردار سے تبدیل کر دیا جاتا اور پھر اقتباس پڑھتے جاتے اور اس کے مفہوم میں یہاں کے کردار و مقام کو سجاتے جاتے۔ یہ طریقہ سلامت علی مہدی نے سب کو تبایا عابد سہیل لکھتے ہیں

> "اطہر صاحب کے کہنے پر ایک دن سلامت علی مہدی نے ہم لوگوں کو" پہلوان کے ہوٹل" میں اس کام کے گر بتائے۔انھوں نے کہا" مکھی پر مکھی بٹھانے کی کوشش مت کرو، اور تمھیں اتنی انگریزی آتی بھی کہاں ہوگی۔بس مفہوم ادا کرو۔ ہوسکے تو کہیں کہیں ادبیت بھی دکھادو۔ ایسا کرو کہ کام شروع کرنے سے پہلے ہر نام کا، وہ کردار ہو یا شہر کا، یا ندی نالے کا، ایک ہندوستانی نام کاغذ پر لکھ لو"(۱۵)

یہ کتابیں اتنے کم وقت میں شائع ہوتیں کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ممکن نہیں تھا اس لئے ترجمہ کرتے وقت مفہوم کی ادائیگی پر ہی توجہ دی جاتی۔"سرخ انگلیاں" کے ترجمے میں بھی اسی طریقہ کار سے کام لیا گیا۔اس ناول کی کہانی میں ڈاکو آخر میں پانی کے جہاز سے فرار ہوجاتے ہیں۔ جب عابد سہیل ترجمہ کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے کہ جہاں ڈاکوؤں کے جہاز کو سمندر میں چلانا تھا تو انھیں کوئی ترکیب نہیں سوجھی کیونکہ کہانی کا سارا تانا بانا تو لکھنؤ شہر کی آب و ہوا میں بنا گیا تھا۔فی الحال کے لئے انھوں نے جہاز کو گومتی ندی میں فروکش کر دیا کہ بعد میں کوئی ترکیب نکال لی جائے گی۔مگر جہاں پروف ریڈنگ کی گنجائش نہ ہو وہاں" دوبارہ" کا وقت کہاں آتا۔لہٰذا ناول چھپ گیا اور ڈاکو اسی گومتی ندی سے پانی کے جہاز کے ذریعہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔کئی مہینہ بعد کتابی دنیا جہاں سے یہ ناول شائع ہوئی تھی ڈھاکہ سے ایک خط عابد سہیل کے نام آیا اس میں انھوں نے لکھا تھا

> "میں بھی لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔شہر کی ترقی کا حال معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی، میرے زمانے میں گومتی ایک چھوٹی ندی تھی جو اب ترقی کر کے ماشاء اللہ

سمندر بن گئی ہے۔ کبھی لکھنؤ جانا ہوتو ضرور دیکھوں گا۔"(۱۶)

عابد سہیل کے باقی سارے ترجموں کی طرح یہ کتاب بھی اب دستیاب نہیں۔ مصنف نے اپنی خودنوشت میں نشاندہی کی تھی کہ کچھ عرصہ تک علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کی کیٹ لاگ میں اس کتاب کا نام دیکھا گیا تھا۔

☆غیر مرئی انسان

عابد سہیل نے ایچ جی ویلس کے ناول The Invisibel Man کا ترجمہ غیر مرئی انسان کے نام سے کیا جس کو کافی پسند کیا گیا اور یہ کتاب بازار اور لائبریری میں موجود بھی ہے۔ اس ناول کا ترجمہ تقریباً نصف صدی میں مکمل ہو پایا۔ اس کی کہانی بھی عابد سہیل کی باقی ساری کہانیوں کی طرح ہی بڑی دلچسپ ہے۔

عابد سہیل سے پہلے اسی ناول کے دو ترجمے ہو چکے تھے جس میں ان کے دوست کا ترجمہ بھی شامل تھا لیکن دونوں ہی ترجمے ناقص تھے۔ ایک بہتر ترجمے کو منصۂ شہود پر لانے کی غرض سے عابد سہیل نے اس ناول کا ترجمہ شروع کر دیا۔ لیکن مصنف کا وہ وقت نہایت سخت تھا جس میں "فرصت" بہت کم تھی اور یہ تمام کام وقت اور سکون طلب ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ کام بیس پچیس صفحات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ صفحات لفافے میں محفوظ عابد سہیل کے ساتھ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے رہے اور ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتے گئے۔ آخر کار وہ اپنے علی گنج والے مکان میں رہنے لگے۔ ایک دن اس ہمراہ لفافے نے اپنی موجودگی کے احساس سے انھیں نونہال کر دیا۔ پھر یہ کام کس طرح آگے بڑھا مصنف کی زبانی ملاحظہ کیجئے

> "ڈھائی تین سال قبل ایک دن ایک چوڑے سے خستہ حال لفافے پر نظر پڑی۔ کسی توقع کے بغیر اسے بس یونہی کھولا تو اس میں سے برسہا برس قبل ترجمہ کئے ہوئے وہ صفحات برآمد ہوئے جنھیں میں گویا بھول گیا تھا۔ خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ ترجمہ یوں ہی سا تھا اور کاغذ اس قدر خستہ ہو چکا تھا کہ اس پر نظر ثانی کرنا ممکن نہ تھا لیکن یہ کاغذات ہاتھ آنے سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ سائنس فکشن کی ایک نہایت عمدہ کتاب کا ترجمہ کرنے کی خواہش جاگ اٹھی مگر اصل کتاب کا میرا نسخہ کھو چکا تھا اور میرے گھر کے پاس کی بڑی دکان پر یہ ناول دستیاب نہ تھی۔ بہر حال، میرے بیٹے ساجد سہیل نے یہ مشکل آسان کر دی۔" (۱۷)

عابد سہیل نے اس کے دوبارہ ترجمہ کرنے کا فیصلہ تو کر لیا لیکن آنے والی مصیبتوں نے انھیں پریشان کر دیا کئی بار تو راہ فرار اختیار کرنے کا بھی خیال آیا مگر "ہمت مرداں تو مدد خدا" کے سہارے ڈٹے رہے۔

”عمر کی اس منزل میں جب ہم زندگی بھر کا سیکھا ہوا خاصی حد تک بھول چکے ہوتے ہیں، اس کتاب کا ترجمہ کرنے کے دوران انگریزی ۔ اردو کے دو تین لغات کو اتنی بار اٹھانا اور رکھنا پڑا کہ جب بھی یہ کام کرنے بیٹھتا، تھوڑی دیر میں ہاتھ دکھنے لگتے اور میں بستر پر دراز ہو جاتا۔۔۔۔جیسے جیسے مقامی بولیوں، ان کے خلط ملط طرز اظہار، لڑائی جھگڑوں، مار پیٹ اور مزدوروں اور مے خانوں میں کام کرنے والوں سے سابقہ پڑتا رہا، زبان کی گتھیاں اور بھی الجھتی رہیں۔ دو چار بار تو جی چاہا کہ بھاغ کھڑا ہوں لیکن ہر بار خود کو سمجھا بجھا کر کام جاری کرنے پر آمادہ کر لیا۔“(۱۸)

کچھ الفاظ کے ترجمے میں عابد سہیل نے شمس الرحمان فاروقی سے بھی مدد لی اور آخر کار 2016 میں ”غیر مرئی انسان“ کے نام سے موسوم یہ ناول منظر عام پر آ گیا۔ 261 صفحات میں پھیلے اس ناول کو مترجم نے تتمہ سمیت 29 حصوں پر منقسم کیا ہے۔ عابد سہیل نے جب اس ناول کا ترجمہ شروع کیا تھا اس وقت سوائے دو ناولوں کے ترجموں کے اور کوئی کتاب ان کے نام سے شائع نہیں ہوئی تھی مگر جب انھوں نے اس کام کو مکمل کیا تو وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے یہاں تک کہ ان کے تینوں افسانوی مجموعے شائع ہو چکے تھے۔غرض یہ کہ وہ ایک مکمل ادیب بن چکے تھے جن کی تحریریں حوالوں کے طور پر پیش کی جانے لگی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ اس ترجمہ میں تخلیقیت کا رچاؤ دیکھنے کو ملتا ہے جو مترجم کی زبان پر قدرت اور فن کاری پر داد دینے کے لئے اکساتا ہے۔کتاب کے یہ دو اقتباس دیکھئے جس میں تخلیقی فضا کتنی حاوی نظر آ رہی ہے

”اس وقت جب رات کا اندھیرا آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہو رہا تھا اور آئی پنگ نے بینک کی چھٹی کے دن کی تباہ حال چیزوں پر خوفزدہ انداز میں نظر ڈالنا شروع ہی کیا تھا، ایک پستہ قد لیکن گٹھے ہوئے جسم کا شخص جو نچا کچھا ریشمی ہیٹ لگائے تھا خاکستری چھال والے درختوں کے پیچھے بلام برے ہرسٹ جانے والی سڑک پر صبح کے دھندلکے میں قدم بڑھا رہا تھا۔اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔وہ تین کتابیں لیے تھا جو ایک طرح کی چمک دار سجاوٹی ڈوری سے ایک ساتھ باندھ دی گئی تھیں۔اس کے پاس ایک اور بنڈل بھی تھا جو ایک نیلے رنگ کے میز پوش میں لپٹا ہوا تھا۔اس کے سرخ تمتماتے ہوئے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تھکا ہوا ہے، جلدی میں ہے اور پریشانی اور اضطراب کے عالم میں بھی۔“(۱۹)

۔۔۔نیند آتے ہی میں پر تخیل اور رنگا رنگ خوابوں میں کھو گیا جو پچھلے چند دنوں کے واقعات پر مبنی تھے۔ میں نے اس بدصورت یہودی مالک مکان کو دیکھا جو اپنے کموں میں چیختا چلاّتا رہا تھا، میں نے اس کے دو قابل تحسین لڑکوں کو دیکھا اور اس عورت کو جس کے ٹیڑھے میڑھے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں اور جو اپنی بلّی کی تلاش میں تھی۔ میں نے کپڑوں کے غائب ہوجانے سے پیدا ہونے والے عجیب وغریب احساس کا دوبارہ تجربہ کیا اور اس طرح میں پہاڑی کے اس جانب آ گیا جہاں ہوا بہہ رہی تھی اور کلیسا کے اس سوں سوں کرتے اور کھانستے عبادت گزار کو دیکھا جو میرے باپ کی کھلی قبر پر بڑبڑا رہا تھا، (۲۰)"

عابد سہیل نے پیش لفظ میں اس ناول کے بارے میں چند صفحات میں گفتگو بھی کی ہے۔ اس کے کمزور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ان کے نزدیک وہ مقام بڑا تعجب خیز ہے جب گرفن (غیر مرئی انسان) ایک ڈپارٹمینٹل اسٹور سے کئی لوگوں کے درمیان سے ایک غیر معمولی طریقہ سے فرار ہوجانے میں کامیاب ہوجاتا ہے حالانکہ یہ کام تو صرف کالے جادو سے ہی ممکن تھا۔ یا پھر گرفن کے ذریعہ کیمپ کے گھر پر کی جانے والی توڑ پھوڑ بھی خلاف فطرت ہے کیوں کہ ایک شخص اتنی زبردست تباہی نہیں کرسکتا۔اس کے علاوہ مصنف کی ایک جگہ براہ راست مداخلت کی نشاندہی بھی کی ہے۔اگر چند سطروں میں اس ناول کی کہانی بیان کرنی ہو تو پیش لفظ کے اس اقتباس سے بہتر ادائیگی کہیں اور ملنا مشکل ہے

گرِفن اپنے غیر مرئی ہوجانے کی بے چارگیوں اور مصیبتوں سے پریشان تھا۔وہ انسانی شکل دوبارہ اختیار کرنا چاہتا تھا اور آئی پنگ اسی مقصد سے گیا تھا خوف و دہشت کی حکمرانی قائم کرنے کا کیال کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا۔اس کی حیثیت ایک رفتنی وگزشتنی خیال سے زیادہ نہ تھی۔ کیمپ نے، جس پر وہ بہت اعتماد کرنے لگا تھا، اس کی دوبارہ انسانی شکل وصورت اختیار کرنے کی کوشش میں تعاون کیا ہوتا تو وہ دونوں بھی خوب فیضیاب ہوتے اور علم طبیعات ایک بہت بڑے انقلاب سے دوچار ہوتا۔خیر ہوتا وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے!(۲۱)

ناول کا بیانیہ خوب ہے اور مکالمے وقت وضرورت کے مطابق استعمال کئے گئے ہیں جس سے ناول قاری

کو اپنے سے جدا ہونے نہیں دیتا۔ یہ بتا پانا بھلے ہی مشکل ہو کہ "غیر مرئی انسان" Tragedy ہے یا Comedy مگر اس ناول کی کامیابی اور مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆ درد کا شجر

افسانہ اور ناول سے جب "کہانی پن" رخصت ہو گیا تو ایسا فکشن سامنے آیا جس میں کرداروں کی سگ بگاہٹ اور محبت کی سرگوشیاں تک سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ ظاہر ہے ان کہانیوں کی عمر بہت نہیں تھی لہٰذا پھر سے کہانی اپنی اصل راہ کی طرف پلٹی اور افسانوں وغیرہ میں پیار بھری باتیں حیرت و استعجاب کے ساتھ کی جانے لگیں۔ ان ہی دنوں عابد سہیل نے بہت سے ایسے افسانے لکھے تھے جنہیں "محبت کے افسانے" کہا گیا۔ یہ وہی دور تھا جس میں عابد سہیل طبعزاد افسانے لکھ بھی رہے تھے اور دوسری زبانوں کے تراجم بھی کر رہے تھے۔ ان کی ترجمہ کردہ روسی، برطانوی، بنگلہ، فرانسیسی کہانیاں کئی رسالوں میں شائع بھی ہو چکی تھیں مگر ان سب کی کوئی نقل عابد سہیل کے پاس نہیں تھی اور جو تھیں وہ انتقال مکانی کی نذر ہو گئی تھیں بس موپاساں کا افسانہ "ڈاکٹر" جسے ہندوستانی رنگ ڈھنگ میں لکھا گیا تھا محفوظ رہ گیا۔ پھر آٹھ دس افسانے اور یاد آ گئے جس میں کیتھرائن مینسفیلڈ کا "سیب کا درخت"، چے خف کا "بوسہ" گورکی کا "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" شامل تھے۔

"پرانی محنت" کی بازیابی ہر شخص کو خوش و خرم اور تازہ دم بنا دیتی ہے۔ یہی حال عابد سہیل کا بھی تھا۔ اس چھوٹے سے روزن نے ان کو ماضی کی محنت و مشقت سے معطر جھونکے کا احساس دلا دیا اور ایک بار پھر انھوں نے زمانہ رفتہ کو یاد کرتے ہوئے چے خف کے The Kiss کا ترجمہ "بوسہ" اور The Dargling کا ترجمہ "جان من" کے نام سے کر ڈالا۔ گورکی کے افسانہ چھبیس مرد اور ایک لڑکی" کا ترجمہ بھی شروع کیا مگر یہ جان کر کہ اس کا انگریزی ترجمہ ہی گڑبڑ ہے چھوڑ دیا کیونکہ خراب ترجمے کا خراب ترجمہ کون پڑھتا۔ اس طرح عابد سہیل نے چند مزید تراجم جمع کر لئے اور اپنی ایک طبعزاد کہانی سمیت دیگر ادیبوں کے افسانے شامل کر کے ساڑھے تین سو سے زائد صفحات کی یہ کتاب شائع کر دی۔ وہ لکھتے ہیں

> "غلام عباس، سید محمد اشرف، علی باقر اور صادقہ نواب کی کہانیوں اور چند شاہکار افسانوں کے تراجم نے "درد کا شجر" کو اچھی خاصی ضخامت بخش دی ہے۔ میں اس کتاب کا نہ پوری طرح مصنف ہوں، نہ مترجم، نہ مرتّب، لیکن ہوس سینے میں

چھپ چھپ کر۔۔۔۔خیر جو بھی ہو۔اس انتخاب کی چند کہانیاں بہت اچھی ہیں،
بہت بہت اچھی۔"(۲۲)

یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ طبعزاد کہانیوں کا ہے جس میں عابد سہیل کے پیش لفظ کے ساتھ، غلام عباس کا افسانہ"اس کی بیوی"، سریندر کمار مہرا کا"چرن کور"،" کچھ قدم دل کے ساتھ ساتھ"، سید محمد اشرف کا"تلاشِ رنگِ رائیگاں"، علی باقری کا" کھلاڑی"، صادقہ نواب کا" پہلی بیوی" اور عابد سہیل کا"ایک محبت کی کہانی" شامل ہیں۔کتاب کے دوسرے حصہ میں ترجمہ کی ہوئیں کہانیاں موجود ہیں۔جن میں اسٹفن زویگ کی کہانی" دل جو ٹوٹ گیا" کا ترجمہ سریندر کمار مہرا نے کیا ہے۔باقی کی تمام کہانیوں کے مترجم عابد سہیل ہیں۔کہانیوں اور ان کے تخلیق کار کے نام مندرجہ ذیل ہیں

" کنول اور شہد کی مکھی"(سنسکرت کہانی)، جان من (چےخف)، بوسہ(چےخف)، مسرت(موپاساں)، میری انسیل(مارٹن آرم اسٹرانگ)، بہانہ(موپاساں)، موڑ موڑ ساتھ(ولیم کا بیٹ)۔

عابد سہیل نے تمام کہانیوں کا ترجمہ نہایت سلیقگی سے کیا ہے۔وہ ایک زمانے تک نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ تھے اور نیوز کی سبنگ سے لیکر خبر کا انٹرو تیار کرنے کا کام بھی بہتر انداز میں کرنا جانتے تھے۔وہ الفاظ کے محل استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ان کے اس ہنر نے ترجمہ نگاری کو مزید نکھار دیا۔عابد سہیل نے صرف انگریزی الفاظ کو اردو میں منتقل نہیں کیا بلکہ ایک اپنی تخلیقی فنکاری سے پوری فضا کو دلچسپ اور قابل رشک بنا دیا ہے۔چےخف کے افسانہ"جان من" کا اقتباس دیکھئے

"It was not till six months later that she took off the weepers and opened the shutters of the windows. She was sometimes seen in the mornings, going with her cook to market for provisions, but what went on in her house and how she lived now could only be surmised". (۲۳)

اب عابد سہیل کے اس ترجمہ پر نظر ڈالئے جو اس اقتباس کے مقابل میں انھوں نے کتاب میں درج کیا ہے۔

"چھے مہینے گذرنے کے بعد اس نے ماتمی لباس اتارا اور دروازے کے پٹ کھول دیے۔ اس نے صبح کبھی کبھی اپنے باورچی کے ساتھ بازار جانا شروع کر دیا لیکن گھر کے اندر وہ کیسے رہتی اور وہاں کیا ہوتا اس کے بارے میں صرف قیاس کے گھوڑے دوڑائے جا سکتے ہیں۔" (۲۴)

اس اقتباس میں عابد سہیل نے اصل متن سے بہتر انداز میں ایک سوگوار فضا کا اظہار کیا ہے۔ ساتھ ہی محاوراتی زبان اتنا بروقت اور برجستہ ہے کہ قاری کہانی سے نہایت قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ Weepers کے لئے "ماتمی لباس" کا استعمال یا پھر "قیاس کے گھوڑے دوڑانا" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اسی کہانی کا ایک اور اقتباس دیکھئے

"One hot July day, towards evening, just as the cattle were being driven away, and the whole yard was full of dust, some one suddenly knocked at the gate. Olenka went to open it herself and was dumbfounded when she looked out: she saw Smirnin, the veterinary surgeon, grey-headed, and dressed as a civilian. She suddenly remembered everything. She could not help crying and letting her head fall on his breast without uttering a word,"(۲۵)

ترجمہ:

"جولائی کے ایک دن میں جب خوب گرمی پڑ رہی تھی، شام کے وقت، جب

مویشی لوٹ کے آرہے تھے اور پورا احاطہ دھول کے مرغولوں سے بھر گیا تھا، یکا یک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اولینکا خود دروازہ کھولنے گئی اور سمرنوف کو دیکھ کر گنگ رہ گئی۔ اس کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ عام لوگوں کی پوشاک پہنے تھا۔ ساری پرانی یادیں اس کی روح میں سیلاب کی طرح داخل ہوگئیں، وہ خود پر قابو نہ پاسکی، پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی اور ایک بھی لفظ منہ سے نکالے بغیر اس نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔"(۲٦)

اس ترجمہ میں بھی عابد سہیل نے زبان کے استعمال سے کہانی کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ لفظ "مرغولوں" سے قاری کے سامنے ایک پورا منظر ابھار دیا جس میں مویشیو کی آنے کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے اور ان قدموں سے اٹھتی ہوی دھول سے بنتا ہوا دائرہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں اس جگہ صرف full of dust لکھا ہے۔ یا پھر "ساری پرانی یادیں اس کی روح میں سیلاب کی طرح داخل ہوگئیں" جملے سے جس فطری اور جذباتی عمل کی عکاسی کی ہے وہ صرف "suddenly remembered everything" سے عیاں نہیں ہو پا رہی تھی۔ عابد سہیل نے کہانی کے لفظوں کو پڑھنے کے بجائے اس ماحول اور فضا کو محسوس کیا ہے جس میں کہانی کار کا ذہن کہانی کو مکمل کرنے کے لئے گردش کرتا رہا۔ یہ عابد سہیل کا کمال ہے کہ وہ اپنے ترجموں میں مقامی تہذیب کو اس طرح ڈھالتے ہیں کہ وہ قاری کو کہانی کا جز معلوم ہوتی ہے کیونکہ پڑھنے والا اسے موقع ومحل کے فطری تقاضوں کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ مثلاً چےخف کے ہی دوسرے افسانہ "بوسہ" میں ایک جگہ اس طرح کا جملہ آتا ہے

!I like your house immensely

ظاہر اس کا سامنے کا ترجمہ یہی ہونا چاہئے کہ "مجھے آپ کا گھر بہت اچھا لگا یا پسند آیا"۔ لیکن عابد سہیل یہاں اودھ کی تہذیب کی ذراسی جھلک دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں

"مجھے آپ کا دولت خانہ یقیناً اچھا لگا"

اردو ادب کے لئے یہ لفظ ایسے موقعوں کے لئے اتنا مانوس ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن و دل کو گمان بھی نہیں رہتا کہ وہ اودھ کی نہیں بلکہ کسی اور دیس کی کہانی پڑھ رہا ہے۔ یا اسی افسانہ میں ایک اور جگہ "Couettishly" کے لئے "عشوہ گری" کا انتخاب کرنا عابد سہیل کی باریک بینی اور ماحول شناسی کا بین ثبوت ہے۔ اس قبیل میں مارٹن آرم اسٹرانگ کا افسانہ کا ترجمہ "میری انسیل" کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ اس کتاب

میں شامل سارے ہی ترجمے عابد سہیل کی ترجمہ نگاری کی عمدہ مثال ہیں جسے پڑھ کر مترجم کی قدر ومنزلت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہنر بھی اس میں پوشیدہ تھا۔

☆حرف کائنات

اس کتاب میں دنیا بھر کے مختلف دانشور، عالم، سیاستداں، ادیب، قلمکار اور غیر معمولی حضرات کے کل ایک ہزار ایک سو گیارہ اقوال شامل ہیں۔ اتنے اقوال کی جمع آوری کا منصوبہ مصنف نے سالوں یا برسوں پہلے نہیں بنایا تھا بلکہ بچپن میں اس طرح کی بعض کتابیں انھوں نے پڑھی تھیں اور مختصر جملے میں فکر کی دنیا کو آباد دیکھ کر وہ ہمیشہ ہی اس میں کھو جاتے تھے۔ عمر کی پختگی میں ایک دن اقوال زریں کی وہ کتابیں یاد آگئیں جن میں یہ مقولے پڑھے تھے۔ لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی سوائے اخبار کے ان کالم کے جہاں پابندی سے اس طرح کے اقوال شائع ہوتے رہتے تھے۔ بس پھر کیا تھا "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے عابد سہیل نے ایسی کتاب کی ترتیب کا عزم کر لیا اور پھر

> "ایک چھوٹا سا نشانہ مقرر کیا۔ وہ نشانہ مختصر سی مدت میں پورا ہو گیا لیکن تشنگی کا احساس باقی اور کام کا سلسلہ جاری رہا، اور پھر جو انھیں شمار کیا تو تعداد سوا ہزار سے آگے نکل گئی تھی۔ ان اقوال میں دس بارہ ایسے تھے جن کا ترجمہ دوبار ہو گیا تھا، کچھ ایسے تھے جو دوسری بار پڑھنے پر اتنے اچھے نہیں لگے جتنے پہلی بار میں لگے تھے اور یہ بھی ہوا کہ ان میں سے بعض کے بارے میں خیال ہوا کہ ہمارے معاشرے میں ان کی معنویت شاید پوری طرح آشکار نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ انھیں قلم زد کر دیا۔" (۲۷)

اس کتاب میں عابد سہیل نے ان اقوال کو جگہ دی ہے جن میں واقعی کوئی علمی یا فکری بات کہی گئی ہو۔ اسی لئے بعض اقوال کو صرف اس لئے ترک کر دیا کہ ان میں معنویت طریق اظہار کی کرم فرمائی تھی۔ اس میں بعض اقوال کے ترجموں کی ضرورت اس لئے نہیں پڑی ہوگی کہ وہ اردو زبان میں پہلے ہی سے موجود ہیں اگر چہ ان کی تعداد اس کتاب میں کم ہے مثلاً نبیؐ و امامؑ کے اقول یا پھر ہندوستانیوں کے اقوال۔

کتاب کا آغاز رسول اکرمؐ کے اس قول سے ہوتا ہے

"وعدہ خلافی یہ نہیں کہ انسان وعدہ کرے اور نیت کے باوجود اسے پورا نہ کر سکے
بلکہ یہ ہے کہ انسان وعدہ کرے اور اسے پورا کرنے کی نیت نہ ہو۔"(۲۸)

اس کتاب میں رسول خداؐ، حضرت علیؑ، ارسطو، سقراط، البرٹ آئن سٹائن، مہاتما گاندھی، گوتم بدھ، آسکور وائلڈ، نطشے، گوئٹے، برناڈ شاہ، رابن شرما، مدر ٹریسا، اندرا گاندھی، رابندرناتھ ٹیگور، جارج ایلیٹ، والٹیئر، برٹرنڈ رسل، لیوٹالسٹائی، تھامس مان، ول اسمتھ، ولیم شیکسپیئر، فرانسس بیکن سے لیکر ڈاکٹر عبدالعلیم، انیس امروہوی، امریتا پریتم اور شاہ رخ خان تک کے اقوال شامل ہیں۔ مصنف نے قول کی معنویت کو اہمیت دی ہے اسی لئے ان اقوال کو بھی جگہ مل گئی ہے جن کے خالق کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ ایسے اقوال کے آگے "نامعلوم" لکھ دیا گیا ہے۔ ایک قول ایسا بھی شامل کیا جو مصنف کو دیوار گھڑی پر لکھا تھا۔

"میں وقتاً فوقتاً تقریبات کی نوید دیتی رہتی ہوں لیکن میری آواز میں خبردار رہنے
کی گونج بھی ہو سکتی ہے۔"(۲۹)

ساتھ ہی کچھ کتابوں مثلاً نہج البلاغہ اور بھگوت گیتا سے بھی بہترین اقوال کو یہاں درج کر لیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب سے مصنف کم الفاظ میں ایک ایسی فکر کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے جس میں سمندر جیسی گہرائی ہو اور انسان جتنا فکر کی گہرائی میں ڈوبتا چلا جائے اتنی ہی اس کی شخصیت ابھرتی چلی جائے۔ اس کتاب کا پیش لفظ نہایت فلسفیانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اقوال کے بارے میں جو گوشے روشن کئے گئے ہیں ان میں جدت کی مکمل چھاپ نظر آتی ہے۔ کتاب کے اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا

"اقوال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آدھے سچ ہوتے ہیں اور آدھے
جھوٹ، اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ آدھا سچ پورے سچ سے زیادہ خطرناک ہوتا
ہے، لیکن کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اس حساب سے پورا سچ آدھے سچ کے مقابلے
میں کے گنا تباہ کن ہو سکتا ہے۔"(۳۰)

اقوال اور مختصر جملوں کا ترجمہ وہ بھی ایسے جملے جو فکر اور معنی کے سمندر سے لبریز ہوں باقاعدہ نثر کے ترجمے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ یہاں جملے میں کم الفاظ میں فکر کی پوری دنیا کو آباد کرنا ہوتا ہے اور مصنف کے ان

نقطہ نظر کومحور ومرکز بنانا ہوتا ہے جس کی طرف وہ اس مختصر سے جملے کے ذریعہ لے جانا چاہتا تھا۔ عابد سہیل کی یہ کتاب ترجمہ نگاری کی صلاحیت کے علاوہ ان کے ذہن کی وسعت کا بھی پتہ دیتی ہے جس نے سینکڑوں دانشوران کے خیال اور فکر کو سمجھا اور پھر دوبارہ ایک نئے ڈھنگ سے انھیں پیش کیا۔

☆ رحمٰن رنگ

اردو ادب میں ۔ یہ صنف رباعی سے بہت قریب ہے۔ اردو دوہا نگاروں کی بہت لمبی فہرست نہیں بلکہ چند حضرات ہیں جنھوں نے اس صنف سخن کا حق ادا کرنے میں نمایاں کوششیں کی۔

عابد پیشاوری انہیں چند افراد میں ہیں جنھوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا اور دوہوں سے اپنی شاعری کو وسعت دی۔ ان کے حالت زندگی کے بارے میں زیادہ کچھ معلومات نہیں ملتی۔ کتاب کے مرتب (عابد سہیل) کے مطابق

> "وہ اپنے اور خاص طور سے اپنے خاندان وغیرہ کے بارے میں بات کرتے ہی نہ تھے۔ کئی بار ذکر چھیڑا مگر یا تو وہ ٹال گئے یا کوئی اور بات نکل آئی۔ تاہم کم و بیش تیس سال کے تعلقات اور اس مختصر سے "نوٹ" کی بنیاد پر جو میرے اصرار پر انھوں نے بھیجا تھا، جتنا کچھ معلوم ہو سکا، کچھ اس طرح ہے۔" (۳۱)

عابد پیشاوری کا نام سرکاری دستاویزات میں شیام لال کالڑا درج ہے۔ ان کی پیدائش صوبہ سرحد کے ڈیرہ اسماعیل خاں کے یہاں ہوئی۔ والد کا انتقال ولادت سے قبل ہو گیا تھا۔ مال و دولت کو لیکر آپسی رسہ کشی کے سبب ان کی پھوپھی انھیں اپنے گھر پیشاور لے آئیں۔ اس وقت عابد پیشاوری کا سن دو مہینے کا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پیشاوری ہو گئے۔

دوہوں سے عابد پیشاوری کو فطری لگاؤ تھا۔ اپنے طاب علمی کے زمانے میں غیر شعوری طور پر ایک دوہا ان کی زبان سے تخلیق پا گیا تھا جس کا مصرع ثانی ان کو آخر عمر تک یاد رہا جو کچھ اس طرح ہے

ٹیرت ٹیرت من تھکیو، ہیرت ہیرت نَین

حالانکہ براندابن میں رہنے کے سبب کرشن لیلا دیکھنے کے علاوہ ہندی یا برج بھاشا سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔اپنی شاعری کے آغاز سے کافی عرصہ بعد سن 1965 کے آخر میں انھوں نے باقاعدگی کے ساتھ دوہے کہنا شروع کئے۔اس وقت وہ جموں کے ایک کالج میں ملازم تھے۔دوہا گوئی کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور دوستوں کی فرمائش پر انھوں نے اس کی اشاعت کا منصوبہ بھی بنا ڈالا اور اس اہم کام کی تکمیل کے لئے عابد سہیل کو اپنا ہمنوا بنالیا۔

عابد سہیل سے ان کی ملاقات احتشام حسین کے توسط سے ہوئی تھی۔ دانش محل میں یہ کہتے ہوئے "یہ ہیں عابد پیشاوری، جموں یونیورسٹی شعبہ اردو سے متعلق ہیں، انشا پر کام کررہے ہیں" تعارف کرایا تھا۔ چند ہی برسوں میں عابد سہیل کے نیم ہم نام ان کے عزیز ترین بن گئے۔وہ جموں میں شعبہ اردو میں استاد تھے جب بھی لکھنؤ آتے عابد سہیل کے یہاں ہی قیام کرتے۔عابد سہیل کی میزبانی اور اخلاص سے وہ بہت متاثر تھے۔اپنی شاعری کے انتخاب کی ذمہ داری بھی انھیں کے سپرد کردی تھی۔لیکن اس خزانے میں دوہے شامل نہیں تھے۔عابد سہیل نے جب علی گنج رہائش اختیار کرلی تو ایک دن وہ تشریف لائے اور ان کے ہمراہ دوہوں کا مسودہ بھی تھا جس کے ساتھ شمیم حنفی کا مقدمہ ملحق تھا۔ دوہوں کی اشاعت میں بعض وجوہات کی بنا پر تاخیر ہوگئی اور اس دوران عابد پیشاوری کا جموں میں انتقال ہوگیا۔عابد سہیل لکھتے ہیں

"عابد پیشاوری نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"اب تو آنکھ بند کرکے تمہارے گھر پہنچ سکتا ہوں" چندروز قبل ایک رات انھوں نے یہی کیا۔گھر کے سارے دروازے توڑ کر وہ آنکھیں بند کیے کیے اس میں داخل ہوگئے اور بولے:

"ان دوہوں کا کیا ہوا؟"

"کون سے دوہے؟" مجھے کچھ یاد نہ تھا۔۔۔۔پھر خواب ہی میں جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔

اور میری آنکھ کھل گئی۔

دماغ نے کام کرنے سے انکار کردیا۔کافی دیر بعد ان کی "موجودگی" کے سحر سے باہر نکل سکا، تو خود سے عہد کیا کہ یہ دوہے ہر حال میں شائع ہوں گے"(۳۲)

اوراس طرح دوہوں کا مجموعہ ”رحمن رنگ“ 2009 میں معرض وجود میں آیا، حالانکہ مصنف سب سے پہلے اس کا نام ”ناشنیدہ“ پھرسات سو دوہوں کو جمع کر کے ”ست سئی“ مگراس میں خاصی تاخیر کے سبب 350 دوہوں پر اکتفا کر کے اس کا نام ”نصف ست سئی“ رکھنا چاہتے تھےلیکن ان کے ایک دوست، کے۔کے۔نیّر نے اس کتاب کا نام ”رحمن رنگ“ رکھنے کا مشورہ دیا۔کتاب کا آغاز شمیم حنفی کے ”تعارف“ سے ہوتا ہےجس میں دوہا نگاری کے رموز کے علاوہ عابد پیشاوری اوران کی دوہا نویسی کے چند پہلوؤں کواجا گر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں

> ”عابد صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ وہ گہری سے گہری بات بھی اس معصومیت کے ساتھ کہتے ہیں جیسے سامنے کی بات ہواور یہی امتیاز ان کے دوہوں میں ایک انفرادیت پیدا کرتا ہے۔۔۔۔عابد صاحب کے دوہوں میں ایک خاص بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ زبردستی کا ہندی لہجہ یا شعوری جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مصنوعی زبان اختیار نہیں کرتے۔انھوں نے دوہے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، صرف اس کی ہیئت یا آکار سے علاقہ نہیں رکھا ہے۔۔۔۔عابد صاحب مانوس اشیا،مظاہر، واردات وواقعات، بصری اورفکری حوالوں کی مدد سے اپنے ہر بیان (Statement) کوایک منطقی اساس فراہم کرتے ہیں، چنانچہ ہر دوہے سے ایک مبسوط اور مکمل تجربہ نمودار ہوتا ہے۔“(۳۳)

”تعارف“ کے دس صفحے کے بعد ”عرض مصنف“ کے دس صفحات کا آغاز ہوتا ہے۔اس تحریر میں عابد پیشاوری نے دوہا نگاری کےفن اوراسلوب کومثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے مثلاً دوہے میں کتنے اوزان ہوتے ہیں، کتنے چھند ہوتے ہیں، اوقاف کی کیا اہمیت ہے، اوزان کی پیمائش کا طریقہ کیا ہے،اوزان میں کمی وبیشی کس طرح قابل قبول ہے وغیرہ وغیرہ۔مصنف نے دوہے سے قریب ترین صنف رباعی کوبطور مثال پیش کیا ہے اور دوہوں کی مختلف جہات کوسمجھانے کے لئے رباعی کی بدلتی ہئیتوں کا سہارالیا ہے۔ایک اقتباس دیکھئے

> جیسے رباعی کا ہرمصرع بیس ماتراؤں کا ہوتا ہے (سب سے پہلے غالباً عظمت اللہ خاں نے اس کا ذکر کیا تھا) جس میں ایک آدھ حرکت یاماترا کی بیشی جائز ہے، کمی نہیں، اخرم اور اخرب کے چوبیس اوزان میں فی مصرع بیس یا اکیس ماترائیں ہیں، انیس کہیں نہیں لیکن دوہے میں کمی وبیشی دونوں درست ہیں۔جس

طرح پرموٹیشن کمبینیشن (Combination) سے رباعی کے اوزان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح اگر دوہے کے وزن کا مختلف زحافات کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو ان کی تعد بھی ہزاروں تک پہنچ سکتی ہے، اگر چہ کسی نے اس کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ایک دوسری طرح سے کچھ حساب کتاب لگایا گیا ہے، مثلاً دوہا چوبیس ماترا کا چھند ہے۔ ایک دوہے میں دو مصرعے اور چار جز یا ٹکڑے ہوتے ہیں۔ ہر مصرع چوبیس ماترا کا ہوتا ہے۔ لیکن ہر مصرعے کے دونوں اجزا "مختلف الماترا" ہوتے ہیں۔ پہلا جز تیرہ (۱۳) اور دوسرا گیارہ (۱۱) ماترا کا ہوتا ہے اور دونوں اجزا کے درمیان وقفہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے اردو کی چند بحروں میں ہے۔ (۳۴)

"حمدیہ دوہا" اور "دوہے" کے بعد کتاب میں دو تحریریں مرتب یعنی عابد سہیل سے منسوب ہیں۔ "یارمہرباں" اور عرض مرتب۔ یار مہرباں میں عابد سہیل نے اپنے دوست کی ملاقاتوں کو یاد کیا ہے۔ یہ خاکہ نما تحریر عابد پیشاوری کے دوستانہ مزاج، متلاشی طبیعت، علمی تفوق، دانشورانہ فکر، ادبی حیثیت وغیرہ کو روشن کرتی ہے۔ عابد پیشاوری جس کام کا عزم کر لیں اسے مکمل کئے بغیر نہیں رہتے۔ اس تعلق سے عابد سہیل نے ایک واقعہ احتشام حسین کا لکھا ہے جس میں وہ (احتشام حسین) بیس سال قبل پڑھی ٹائیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک انگریزی کتاب کا ذکر کرتے ہیں جس میں انشا اور ان کے والد کے بارے میں کچھ معلومات موجود تھی مگر نہ تو کتاب کا نام یاد تھا اور نہ ہی مصنف کا۔ عابد پیشاوری تین چار دن میں وہ کتاب تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ مرشد آباد کی تاریخ سے متعلق تھی جس میں ایک معاہدہ کی تفصیلات درج تھی جس پر کلائیو نے (جو بعد میں لارڈ بنے) ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے، شجاع الدولہ اور جگت لال یا ایسے ہی کسی نام کے ایک شخص نے اودھ کی جانب سے اور نواب بنگالہ کی طرف سے میر ماشااللہ نے دستخط کئے تھے۔

عابد پیشاوری نے دوہا گوئی میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کے دوہوں میں معنویت ہے، برجستگی ہے، زبان کی لطافت ہے اور سہل انداز گفتگو بھی موجود ہے۔ بعض دوہوں میں جگ بیتی کی پرچھائی کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کا عکس بھی نظر آتا ہیں۔ ملاحظہ ہو

دیا دریا ہے بجھائے جب تک سب کی پیاس

خود پیاسا ہو جائے تو کوئی نہ پھٹکے پاس

☆☆☆

گذر جاتے ہیں قافلے بھونکیں کتے لاکھ

دینا جواب جاہلاں کھونا اپنی ساکھ

☆☆☆

دنیا کی ریت ہے دیں کس کو الزام

چڑھتے سورج کو کریں عابدؔ سبھی سلام

☆☆☆

اور کوئی دشمن نہیں اپنا ہی بغض ونفاق

وہ قومیں مٹ جائیں گی جن میں نہیں اتفاق

☆☆☆

کیا قومیں، افراد کیا، کیا اپنے ، کیا غیر

غرض بنائے دوستی غرض مٹائے بیر

مذکورہ دوہوں میں زمانے کی حالت،قوم کی زوال پذیری،آپسی بغض ونفاق غرض کہ وہ مسائل بیان کئے ہیں جن سے انسانیت نبرد آزما ہے۔المختصر دوہوں کے حوالے سے یہ کتاب اردو ادب کی تنگ دامنی کو ضرور وسعت عطا کرے گی اور بقول مرتب

"شمیم حنفی اور عابدؔ پیشاوری کے مضامین میں دوہے کے فنی اور تکنیکی پہلو زیر بحث آئے ہیں۔امید ہے کہ ان مضامین سے "دوہا فہمی میں اضافہ ہوگا"۔"(۳۵)

یہ کتاب عابد سہیل کی ادب نوازی کو ہی ظاہر نہیں کرتی بلکہ ان کی انسان دوستی کی بھی مخلصانہ مثال ہے۔

☆باغات

نیشنل بک ٹرسٹ کی گذارش پر لئیق فتح علی کی انگریزی کتاب Garden (1978) کا ترجمہ عابد سہیل نے باغات کے نام سے کیا۔ یہ کتاب باغوں، درختوں اور پودوں وغیرہ کے علم وفن سے متعلق تھی۔ کتاب کی مصنفہ اپنے پیش لفظ میں لکھتی ہیں

> کتاب لکھتے وقت چوں ک یہ بات ذہن میں رکھنے سے مدد ملتی ہے کہ وہ کن لوگوں کے لئے لکھی جا رہی ہے اس لئے میں نے یہ سوچ کر قلم اٹھایا تھا کہ میں نوجوان ماہرین تعمیر اور سول انجینئروں کے لئے لکھ رہی ہوں۔ باغات لگانے اورعوامی استعمال کی جگہوں کے نقشے تیار کرنے کا زیادہ سے زیادہ کام ان ہی ماہرین کے سپرد کیا جائے گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ انھیں اس کام کو اچھی طرح سے انجام دینے سے متعلق تمام معلومات بھی حاصل ہوں گی۔(۳۶)

عابد سہیل ناول، اخبار وغیرہ کی تحریروں کے تراجم تو کرتے رہتے تھے لیکن اس نوعیت کے ترجمے کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ مترجم لکھتے ہیں

> میں نے اس طرح کی تصنیف کو اردو قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ تجویز قبول کرنے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ ایک سبب اس کا یہ تھا کہ کتاب کا موضوع مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا تھا۔(۳۷)

عابد سہیل نے یہ کتاب تین چار دن میں مکمل پڑھ ڈالی۔ مطالعہ کے بعد انھوں نے اس فن کو بہترین نثری ادب سے تعبیر کیا اور اپنی تاثرات بیانی میں یہ واضح کیا کہ فلائبر اور بالزک کے ناول میں استعمال ہونے والی فکریں اور تشبیہیں جو دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور لطف انبساط کا سامان فراہم کرتی ہیں، اس احساس و تجربوں سے ہمکنار نہیں کرا سکتی جو اس کتاب کے بعد مجھے ہوا۔ بقول مصنف یہ مطالعہ

> "۔۔۔۔ایک ایسا تجربہ تھا جس کی نوعیت مطالعہ کے سارے سابقہ تجربوں سے جدا تھی"(۳۸)

اس کتاب میں ہندوستان کے علاوہ ایران، فرانس ، جاپان وغیرہ کے باغوں اوربعض میں بڑی بڑی تعمیرات کا تذکرہ کیا ہے نیز باغوں کی حفاظت اوراس کی آرائش وغیرہ کے بیان اور مویشیوں سے اس کومحفوظ رکھنے کے طورطریقوں کا بھی اندراج ہے۔کتاب چار حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا عنوان" باغوں کی تشکیل کے اصول"، دوسرا" باغوں کی تشکیل کا سامان"، تیسرا"صنعتی باغ"، چوتھا"عوامی استعمال کے باغ"۔

اس کتاب کا ترجمہ عابد سہیل کے لئے اگرمشکل نہیں تو آسان بھی نہ تھا۔ کیونکہ یہ کتاب ادبی فن کے بجائے ایک خاص علمی نوعیت کی تھی اور عابد سہیل باغبانی سے بہت زیادہ آشنا نہیں تھے۔اس امر کے ذریعہ مترجم نے اپنی ریاضت وصلاحیت کا ایک بار پھر امتحان لیا اور کتاب کا تخلیقی انداز میں ترجمہ پیش کر کے صلاحیتوں کی فتح کا اعلان کیا۔

☆☆☆☆

ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے جس کا احساس عابد سہیل کو بخوبی تھا۔وہ اس کی باریکیوں سے بھی پوری طرح واقف تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجمے سطحی ترجموں سے مختلف ہوتے کیوں کہ وہ زبان کے الفاظ کے بدلے دوسری زبان کے الفاظ کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ بین السطور پنہاں معانی ومطالب کی جلوہ گری کو دوسری زبان میں روشن کرنے کی کوشش کرتے۔اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں

> "ترجمے میں ان مسائل کے علاوہ جو کسی مضمون یا کتاب کی زبان سے اس طرح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ایک بڑی مشکل یوں پیش آتی ہے کہ خیال کو ایک زبان کے کینڈے سے دوسری زبان کے کینڈے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ یہ دقّت اردو سے ہندی یا ہندی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت نہیں پیدا ہوتی کیونکہ دونوں زبانوں کے کینڈے بنیادی طور پر ایک ہی ہیں جب کہ مثلاً اردو اور انگریزی کے درمیان اس نقطہ نظر سے رشتے کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔(۳۹)

مذکورہ کتب کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ عابد سہیل نے ترجمہ نگاری کے فن کو نئی بلندیوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے ترجموں میں تہذیب کا رنگ، ثقافت کا عکس، مصنف کی ذہنی کیفیت اور دم تحریر کے عہد کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کی آنچ بھی نظر آتی ہے۔اس معیار کے تراجم اردو ادب میں کم دیکھنے کو ملیں گے۔اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ عابد سہیل نے ترجمہ نگاری میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

☆ اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل

اردو کے فروغ اور اس کے تابناک مستقبل کے لئے 20 تا 26 اپریل 1979 کو اردو اکادمی اتر پردیش کے زیر انتظام "اردو ہفتہ تقریبات" کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں ایک دن اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل اور حل پر بھی بحث کی گئی اور اس سلسلہ سے 22 اپریل کو ایک سیمینار بعنوان "اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل" منعقد ہوا۔ عابد سہیل اس سیمینار کے کنوینر تھے۔ سیمینار میں شہر و بیرون شہر کے دانشوران کے علاوہ رسالوں کے 23 ذمہ داران نے شرکت کی اور 18 مقالات پیش کئے گئے۔ اردو اکادمی کی درخواست پر عابد سہیل نے ان مقالات کو جمع کیا تھا جسے اردو کادمی نے "اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل" عنوان سے 1981 میں شائع کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ ادبی رسالوں خصوصاً اردو کے جرائد کو ہمیشہ سے ہی مشکلوں کا سامنا رہا ہے اسی لئے حکومتی امداد یافتہ رسالوں کے علاوہ چند ہی پرچے عرصہ دراز تک اپنی اشاعت کو یقینی بنانے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ حکومتی امداد یافتہ رسالوں کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ وہ حکومتی پالیسی کے تحت مضامین کی اشاعت میں پوری طرح آزاد نہیں ہوتے جب کہ ادب کو جبراً کسی ایک راہ پر نہیں چلایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادبی رسائل کے مسائل ایک بہت سنجیدہ موضوع تھا جس پر ایک ترتیب شدہ پروگرام کے تحت گفتگو ہونا اشد ضروری تھا۔ اتر پردیش اکادمی نے اس سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے نہ صرف سیمینار منعقد کیا بلکہ اس میں پڑھے گئے مقالات کو یکجا کر کے ضائع ہونے سے محفوظ کر لیا۔

اس کتاب میں عابد سہیل کے پیش لفظ اور مضمون (خیر مقدم اور چند معروضات) کے علاوہ ابوالکلام قاسمی، افتخار احمد صدیقی، ایس۔اے۔حسن، روشن آرا، رونق جہاں زیدی، سلطان سبحانی، شاہد ماہلی، شہباز حسین، شین مظفر پوری، ضیاالحسن فاروقی، عبدالصمد، فرخ جعفری، کمار پاشی، گوپال متل، مسعودالحسن عثمانی، اور وقار خلیل کے مضامین شامل ہیں۔

اس کتاب کے مشمولات میں اردو کے ادبی جرائد کی حالت پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔ زیادہ زور اس بات پر ہے کہ آخر رسالوں کی مسلسل اشاعت کو کس طرح باقی رکھا جائے۔ اس تعلق سے کچھ مشورے بھی دئے گئے ہیں اور تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ عابد سہیل نے اپنے پیش لفظ میں پیش کردہ تجاویز کے چند بہت اہم حصوں کو شامل کیا

ہے۔مثلاً

☆ اردو اکاڈمیوں کو سنجیدہ، علمی اور ادبی جرائد کی جلدیں معقول تعداد میں خرید کر ان لائبریریوں کو دینی چاہئے جنھیں مالی امداد دیتی ہیں۔

☆ اکاڈمیاں ریاستی حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ان پرچوں کو سرکاری امداد پانے والی اور سرکاری لائبریریوں کے لئے منظور کریں۔

☆ ہر اکاڈمی ایک ایک ہزار روپئے کی سالانہ امداد ملک کے پانچ منتخب ادبی جریدوں کو دے۔

☆ صوبائی حد بندیوں سے اٹھ کر اکاڈمیوں کو چاہئے کہ اپنے مطبوعات کے اشتہارات ادبی جرائد کو دیں۔

☆ اشتہارات کے حصوں کے لئے منظم طور پر کوششیں کی جائیں اور اس کام کے لئے تربیت یافتہ افراد رکھے جائیں۔

☆ محکمہ اطلاعات اور ڈی۔اے۔وی۔پی ادبی ماہناموں کے لئے اشتہارات کا ایک علاحدہ کوٹا مقرر کرے۔

☆ اکاڈمیاں مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے درخواست کریں کہ وہ ڈی۔اے۔وی۔پی اور پبلک سیکٹر کے اداریوں کی توجہ ادبی جرائد کی طرف مبذول کرائیں اور ان کو ادبی رسائل میں اشتہارات دینے کی افادیت بتائیں۔اکاڈمیاں یہ کام خود بھی کریں۔اکاڈمیاں اشتہارات کا کاروبار کرنے والی کمپنیوں اور بڑے تجارتی اور صنعتی اداروں کو بھی اس جانب متوجہ کریں۔

ان مشوروں کے علاوہ ماہنامہ آج کل کے مدیر مہدی عباس حسینی نے ادبی رسالوں کی تنگ دامنی کا حوالہ دیتے ہوئے سیاسی، عمرانی اور سماجی تمام تحریروں کی شمولیت کی بات کہی۔ان کا کہنا تھا کہ چند نظموں، غزلوں، افسانوں اور مضامین کے مجموعے کو ادبی جریدہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔اسے زیادہ سے زیادہ ادبی تخلیقات کے مجموعے کا نام دیا جاسکتا ہے۔اس مشورے پر کافی بحث ہوئی۔گوپال متل رسالوں میں سیاسی تحریر کو شامل کرنے کے خلاف تھے۔ان کے نزدیک سیاسی خبروں اور تبصروں کے لئے جو اخبار پہلے سے موجود ہیں، وہ ان سے انصاف نہیں کر پاتے اور صحیح صورت حال پیش کرنا دشوار ہوتا ہے تو بھلا ادبی جرائد یہ انصاف کیسے کر پائیں گے۔اس

موضوع پر کافی بحث ہوئی اور بعض کا نظریہ تھا کہ رسالوں میں سیاسی مضامین بھی شائع ہونا چاہئیں تا کہ قارئین کا حلقہ وسیع ہو سکے۔

اس موقع پر خلیق انجم نے ادبی جرائد کے مدیروں کی ایک کل ہند تنظیم بنانے کی تجویز بھی پیش کی۔ جس پر غور وفکر کے بعد یہ طے پایا کہ تنظیم بنانے کا کام ایک کل ہند کانفرنس کے لئے اٹھا رکھا جائے اور اس مقصد کے لئے ایک ایڈ ہاک کمیٹی بنا دی جائے۔ اس گیارہ رکنی کمیٹی میں عابد سہیل بھی شامل تھے مگر بقول عابد سہیل

> "یہ کمیٹی اب تک اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھا سکی ہے لیکن یہ امید بے جا نہ ہوگی کہ اس بے حد ضروری کام میں اب زیادہ تاخیر نہ کی جائے گی۔"(۴۰)

عابد سہیل نے ایک دہائی سے زیادہ عرصہ تک ماہنامہ کتاب کی اشاعت کو جاری رکھا تھا اس لئے وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس راہ میں کون کون سی مشکلات دامن گیر ہوتی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے کتاب کی ترتیب میں دلچسپی بھی لی اور اپنی تحریر میں دامن گیر مشکلات سے گلوخلاصی کی ترکیب بھی بتائی۔

یہ کتاب عابد سہیل کے پیش لفظ سے شروع ہو کر ان کے مضمون "خیر مقدم اور چند معروضات" پر مکمل ہوتی ہے۔ اپنے مضمون میں انھوں نے اولاً ادبی جرائد کی افادیت اور اہمیت کو خوبصورت ڈھنگ سے روشن کیا ہے۔ اس حصہ کو مضمون کی "تشبیب" بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ شروعاتی چند اقتباسات کے ذریعہ قاری، ادبی رسالے کو اپنی زندگی کا لازمی جز تسلیم کر لیتا ہے اور اس کی طبیعت رسالوں کے مسائل اور حل کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح آنے والے اقتباسات جن میں اصل مدعے کو بیان کیا گیا ہے، قاری کی طبیعت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں، جو کہ مضمون نگار کا اصل مقصد ہے۔ مضمون کا دوسرا اقتباس دیکھئے جس میں جرائد کے افادی پہلوؤں کو کس طرح روشن کیا گیا ہے

> "آپ حضرات کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی اردو ادب کی ترقی ادبی اور علمی رسائل کی مرہونِ منت رہی ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک ہو یا جدیدیت کا رجحان ان کو فروغ رسائل کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکا ہے اور جب تک کسی ادبی تحریک کو اچھے رسائل کی مدد اور تعاون حاصل نہیں ہوا اس وقت تک وہ پھل پھول نہ سکی۔"(۴۱)

اس کے علاوہ تخلیق کے لئے مہمیز کرنا، کتابی شکل سے پہلے تخلیقات پر نظرِ ثانی کرنا، ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنا (کیونکہ کتاب شائع کرانے پر ہر شخص قادر نہیں ہوتا) جیسے فوائد کو بھی رسالوں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔فوائد شماری کے بعد عابد سہیل کا یہ جملہ "ادب اور زبان کی ترقی کے لئے رسائل کی اہمیت اس قدر بدیہی ہے کہ اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں" مضمون میں "گریز" کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے بعد مضمون نگار اپنے اصل مقصد کا آغاز نہایت خاموشی سے کرتے ہوئے قاری کو سنجیدگی کے ساتھ ذکر کردہ مسائل پر غور کرنے کے لئے آمادہ کر لیتا ہے۔

عابد سہیل نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے وہ بہت بنیادی ہیں جن کے حل کے بغیر کسی بھی رسالے کو طولانی عمر نہیں عطا کی جاسکتی۔مضمون نگار کے نزدیک رسالہ کی غیر منقطع اشاعت کے لئے لازمی ہے کہ وہ مالی طور پر خود کفیل ہو۔یعنی خریداروں کے زر سالانہ، ایجنسیوں کے ذریعے فروخت ہونے والے پرچوں سے حاصل ہونے والی رقوم اور اشتہارات سے اپنے سارے اخراجات پورے کرے۔عابد سہیل کے نزدیک فقط مالی بحران ہی ادبی جرائد کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ مدیر کی آزادی کو بھی نہایت اہم تصور کرتے ہیں۔اسی لئے وہ اشتہارات کی چکا چوند میں یہ پہلو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ ادبی اعانت کے نام پر حاصل ہونے والی رقوم رسالے کی آزادی سلب کر لیتی ہے اور مدیر کو فیصلہ کرنے میں مفلوج بنا دیتی ہے۔وہ رسالے کے معیار اور وقار کے لئے مدیر کے آزاد اور پرسکون ہونے پر زور دیتے ہیں اور رسالے کی ترتیب میں بغیر تنخواہ و اعزازی مدیر کی چلی آرہی روایت کو غلط قرار دیتے ہیں۔بقول مرتب

> "اب آپ خود ہی سوچیں کہ ادیبوں اور دوستوں کے احسانوں تلے دبا ہوا مدیر، جسے اپنی ملازمت یا ذریعہ معاش سے بچے ہوئے وقت میں یہ سارے کام بھی کرنا پڑتے ہوں، اپنے رسالہ کا معیار بھلا کیسے برقرار رکھ سکے گا۔سچ پوچھیے تو اردو کے ادبی رسائل کو مدیر نصیب ہی کہاں ہیں؟" (۴۲)

عابد سہیل نے ایک رسالے کی تعدادِ اشاعت اور خرچوں کے تناسب کا بھی ذکر کیا ہے۔اکثر حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ تعداد اشاعت کے بڑھ جانے سے منافع میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔اس بات کو عابد سہیل نے بہت آسان لفظوں میں مثالوں کے ساتھ سمجھایا ہے۔ساتھ ہی اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر تعداد اشاعت 5 ہزار سے تجاوز کر جائے تو پھر اس کی نوعیت مختلف ہو جائے گی۔یہ تمام باتیں اتنی پریکٹکل ہیں کہ ان کی

وضاحت وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اس وادی میں ایک عرصہ گذارا ہو۔عابد سہیل نے اپنے تجربے کی بنا پر جن تجاویز کو پیش کیا ہے وہ اس طرح ہیں

☆ ریاستی حکومتیں ادبی رسائل کو جو بیشتر صورتوں میں ماہنامے ہوتے ہیں، اشتہارات کی فہرست میں اسی طرح شامل کریں جس طرح ہفت روزہ اور پندرہ روزہ جریدوں کو شامل کیا جاتا ہے اور انھیں ہر ماہ پورے صفحہ کا کم سے کم ایک اشتہار ضرور دیں۔

☆ ریاستی حکومتیں اپنی اور سرکاری امداد پانے والی لائبریریوں کے لئے اردو کے ادبی جرائد بھی خریدیں۔

☆ اردو اکادمیاں ان لائبریریوں کے لئے جنھیں وہ مالی امداد دیتی ہیں معیاری ادبی جرائد کی خریداری نہ صرف لازمی قرار دیں بلکہ ان کو دی جانے والی امدادی رقوم ہی سے ان رسائل کا زرسالانہ وضع کرلیں۔

☆ اردو اکادمیاں کتابوں کی طرح ادبی رسائل پر بھی پبلشر کا ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کریں اور رسائل کی اشاعت کے تسلسل کے پیش نظر انعامات کے درمیان وقفہ کی کوئی شرط نہ رکھیں۔

☆ اردو اکادمیاں معیاری جرائد و رسائل کو سال میں کم از کم چھ بار اشتہارات جاری کریں۔ان شتہارات کا نرخ Davp اور متعلقہ ریاستی حکومت کے منظور کردہ نرخوں سے کسی طرح کم نہ ہونا چاہئے۔

☆ اکادمیاں مرکزی و ریاستی حکومتوں سے درخواست کریں کہ وہ ڈی۔اے۔وی۔پی اور پبلک سیکٹر کے اداروں کی توجہ ادبی جرائد کی طرف مبذول کرائیں اور ان کو ادبی رسائل میں اشتہارات دینے کی افادیت بتائیں۔اکادمیاں یہ کام خود بھی کریں اور اشتہارات کا کاروبار کرنے والی کمپنیوں اور بڑے تجارتی صنعتی اداروں کو بھی اس جانب متوجہ کریں۔

آج بھی اردو جرائد کے مسائل جوں کے توں ہیں اس لئے دہائیوں قبل جن تجاویز کو عابد سہیل نے بیان کیا تھا، ان کی معنویت میں کسی طرح کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ہاں! ان پر عمل کرنا زمانے کے امتداد کے ساتھ مزید مشکل ہوتا جارہا ہے اور ادبی جرائد کے حالات آپ سب کے پیش نظر ہیں۔بہرحال سات صفحات پر مشتمل عابد سہیل کا یہ مضمون رسالوں کی کامیابی کے "منتر" سے پُر ہے۔"اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل" کو ترتیب دے کر عابد سہیل نے رسالوں کی ڈوبتی نبض میں دوبارہ روح پھونکنے کا قابل ستائش کارنامہ انجام دیا ہے جس پر عمل کی

اشد ضرورت ہے تا کہ اردو رسائل کے مستقبل کو تاریکی سے محفوظ رکھا جا سکے۔

☆ انتخاب مضامین احمد جمال پاشا

لکھنو میں دو ہستیاں ایسی تھیں جو مختصر وقت میں شہرت کے آسمان پر مثل چاند نمودار ہوئیں اور قلیل مدت میں موت کے گہن نے ان کی رونق افشاں حیات کو خاموش کر دیا۔ ایک تو مجاز جن کی شاعری کی دھوم قریہ قریہ گاؤں گاؤں تھی اور دوسرے احمد جمال پاشا جن کی طنز و مزاح نگاری قارئین کو ہنسنے کے علاوہ حقیقتِ حیات کو ایک نئے رخ سے سمجھنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اسے حسن اتفاق ہی کہیں گے کہ احمد جمال جب والد کے ساتھ الہ آباد سے لکھنؤ آئے تو امین آباد کے اسی گھر پر مقیم ہوئے جو کبھی مجاز کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔

احمد جمال سرکاری دستاویز کے مطابق یکم جون 1936 میں پیدا ہوئے۔ والد پیشہ سے جج تھے جو سبکدوشی کے بعد لکھنؤ آ گئے تھے۔ احمد جمال پاشا نے اسلامیہ اور کوئنس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کرشچین کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی کا رخ کیا۔ ایم۔اے کرنے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔ لکھنؤ واپس آ کر انھوں نے ماہنامہ اودھ پنچ جاری کیا اور پھر قومی آواز اخبار کے شعبہ ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ کم و بیش پندرہ سال کے بعد انھیں بہار یونیورسٹی کے اسلامیہ کالج میں ملازمت کا موقع ملا اور وہ وہیں منتقل ہو گئے۔ بہار میں احمد جمال نے ”پاشا اورینٹل ریسرچ سینٹر“ کے قیام سے ادب کی خدمت انجام دی۔ جہاں نایاب مخطوطات اور طنز و مزاح سے متعلق نادر کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔ بقول عابد سہیل

> ”اس موضوع (طنز و مزاح) پر یہ سینٹر برصغیر کا شاید سب سے بڑا کتب خانہ ہے جس سے استفادہ کے لئے ملک اور بیرون ملک تک سے طلبہ سیوان آتے رہتے تھے۔“ (۴۳)

احمد جمال پاشا نے اپنی مزاح نگاری کی شروعات لکھنؤ سے کی تھی۔ جب اپنی پہلی کاوش انھوں نے عابد سہیل اور دیگر دوستوں کے سامنے پیش کی تو سب نے ان کے باطن میں انگڑائی لیتے مزاح نگار کو دیکھ لیا تھا جس نے آنے والے زمانے میں طنز و مزاح کے دھارے کو ایک نیا رخ دیا۔ تقریباً پچیس کتابوں کے تخلیق کار احمد جمال پاشا نے نثری مزاح نگاری کے علاوہ پیروڈی بھی لکھی۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں مرتبِ کتاب نے پاشا کی

مزاح نگاری کا سفراس کے نشیب وفراز کے ساتھ بیان کیا ہے

”جمال کا فکری سفرمزاح سے طنز کی جانب تھا لیکن انھوں نے شروع ہی میں جن اوزاروں کا انتخاب کیا تھا، یعنی رعایت لفظی اور ہم صورت الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش، ان سے وہ طنز میں بھی کام لیتے رہے جس کی وجہ سے ان کے طنزیہ مضامین میں وہ خشکی اور واعظِ تنگ نظر کی وہ تندی اور سخت گیری نہ پیدا ہوئی جس کا شکارا کثر طنز نگاری ہوجاتی ہے۔انھوں نے اپنے سفر کے وسط میں واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں جلد ہی احساس ہوگیا کہ اس کے ڈانڈے بہ آسانی پھکڑ پن سے مل جاتے ہیں اور لطافت کا وہ جوہر مفقود ہوجاتا ہے جو مزاح کو تبسمِ زیرِلب اور طنز کو خوبصورت فریم میں جڑا ہوا آئینہ بنا تا ہے۔“(۴۴)

اس کتاب سے قبل احمد جمال پاشا کی تحریروں کا کوئی انتخاب شائع نہیں ہوا تھا۔اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اردو اکادمی اتر پردیش نے احمد جمال پاشا کے مضامین کا انتخاب کرنے کی درخواست عابد سہیل سے کی، جسے انھوں نے نہ صرف قبول کیا بلکہ بہترین تحریروں سے آراستہ کتاب ”انتخاب مضامین احمد جمال پاشا“ کے نام سے پیش کی۔اس کا پہلا ایڈیشن 28 فروری 1988 میں شائع ہوا۔اس کتاب میں احمد جمال پاشا کے، ادب میں مارشل لا،شکر کا چکر،ستم ایجاد کرکٹ اور میں بے چارہ، غدر 1957 کے اسباب، کپور۔ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، کتے کا خط پطرس کے نام،شرافت کی تلاش میں،میز بان بے زبان،فن لطیفہ گوئی،علیم صاحب،کل ملا کر 10 مضامین اور عابد سہیل کا معلوماتی مقدمہ بھی شامل ہے۔جس میں مرتب نے احمد جمال کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے فن پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

طنز ومزاح کی تاریخ پر غور کیجیے تو یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ اس فن کے توسط سے فقط ہنسنے ہنسانے کا کام نہیں لیا گیا بلکہ بڑے بڑے مسائل اوراس کے حل کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔چاہے وہ اکبرالہ آبادی کی شاعری ہو یا کنہیا لال کپور اور پطرس بخاری کی نثر۔یہی اثر انگیزی احمد جمال پاشا کے مضامین میں بھی ملتی ہے ان کی تحریریں قارئین کو وقتی لطف ومسرت فراہم نہیں کرتیں بلکہ سماج میں پیدا ہونے والی کمزوریوں اور نقائص کی طرف توجہ دلاتی ہیں اور زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ عصری مسائل کو زیرغور لانے کی ترغیب دیتی ہیں۔کتاب کے منتخب مضامین کو احمد جمال پاشا کی نمائندہ تحریروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

☆ فکشن کی تنقید چند مباحث

عابد سہیل کے فکشن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ افسانوی ادب کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔کہانیوں اور عابد سہیل کا ساتھ بچپن کا تھا اسی لئے وہ جانتے تھے کہ کہانی میں "کب کیا ہونا چاہئے" اور" کیا کس طرح ہونا چاہئے"۔افسانوی ادب سے اتنی قدیم شناسائی کے باعث اس صنف کے نشیب وفراز اور بدلتے پھیلتے امکانات ورجحانات ان کے پیش نظر تھے لیکن کبھی انھوں نے اس سمت کچھ مبسوط طریقہ سے نہیں لکھا اور نہ اس نوعیت کی اپنی منتشرہ تحریروں کو جمع کیا۔ لیکن جب فکشن پر جدیدیت کے حوالے سے بعض اعتراضات کئے گئے اور ایسے اصناف ادب کو جو بنیادی طور سے ایک دوسرے سے مختلف تھے،ایک ہی پیمانہ سے آنکا جانے لگا تو اس کا جواب عابد سہیل نے فکشن کی تنقید کے ذریعہ دیا۔

"دی نیوز آف اسٹڈی" کے انٹرویو میں عابد سہیل نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا

In that book, questions raised by modernism in Indian fiction have been discussed in an impassioned manner philosophically.
shams-ur-Rehman Farooqi(a leading urdu critic) has said publicly that the best articles in indian and pakistan contradicting his point of view have been written by Abid Suhail.

(۴۵)،Everywhere Without Being Visible

اس کتاب نے عابد سہیل کی فکشن تفہیم کو مزید نکھار دیا۔ان کی تنقیدی صلاحیت کے بارے میں پروفیسر عبدالصمد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"عابد سہیل کا تنقیدی شعور بہت بالیدہ تھا۔انہوں نے تنقید نگار ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔۔۔تنقید نگاروں کی فہرست میں ان کا نام بھی درج نہیں ہے مگر

انھوں نے جو تنقیدی مضامین اور نوٹ لکھے ہیں وہ بہ حیثیت ایک باشعور تنقید نگار
کے ان کی پہچان کے لئے کافی ہیں۔"(۴۶)

فکشن تنقید عملی تنقید کا بہترین نمونہ ہے کیوں کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے میں فکشن پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں جس میں عابد سہیل نے کچھ اصول ضوابط طے کئے ہیں اور دوسرے حصہ میں متعدد افسانوں کے تجزیے پیش کئے ہیں، جن میں بیان کردہ اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔ پہلے حصہ میں میں شامل مضامین کے نام ہیں۔"افسانہ کی تنقید۔ چند مباحث۔ ا"، "افسانہ کی تنقید۔ چند مباحث۔ ۲"، "افسانہ کی تنقید۔ چند مباحث۔ ۳"، "تہذیب، ثقافت اور افسانہ"، "ویرانے۔ ایک مطالعہ"، "اردو افسانہ۔ مسائل اور رجحانات"، "جدید ناول کا فن ایک مطالعہ"۔ کتاب میں جن افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ اس طرح ہیں۔" پیتل کا گھنٹہ"(قاضی عبدالستار)، " افق اور عمود" (مجید انور)، "تین مائیں۔ ایک بچہ"(خواجہ احمد عباس)، "نیا قانون"(منٹو)، "مراسلہ"(نیر مسعود)، "کھیل کا تماشائی"(جیلانی بانو)، "ٹیبل لینڈ"(اوپیندر ناتھ اشک)۔ یہ مضامین اور تجزیے 1968 سے لیکر 1988 کے درمیان لکھے گئے جنھیں نظر ثانی کے بعد کتابی شکل دے دی گئی۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانوی ادب کی تفہیم کے تعلق سے عابد سہیل بعض الجھنوں کے شکار رہے کچھ ایسے مسائل تھے جو ان کو پریشانی میں مبتلا کئے رہتے تھے۔

مثلاً

ا۔"پھر کیا ہوا" کی افسانوی ادب سے تعلق کی نوعیت کیا ہے اور کیا ہر واقعاتی ترتیب سے یہ عنصر وجود میں آجاتا ہے؟

۲۔ افسانہ میں سارا کھیل واقعہ کے گرد ہوتا ہے اور واقعہ چوں کہ "زمان و مکان" کا اسیر ہوتا ہے اس لئے مستقبل قریب اور مستقبل بعید میں اس کی علاقہ مندی (relevance) کیسے قائم رہتی ہے؟ مزید یہ کہ افسانہ میں "واقعہ" کے وقوع پذیر ہونے کے وقت بھی، خاصی یکسانیتوں کے باوجود، چونکہ ہر شخص ایک ہی "زمان و مکان" میں سانس نہیں لیتا، یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے۔

۳۔ افسانہ کے لئے حقیقت کا التباس حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے تا کہ قاری کے ذہن میں یہ سوال پیداہ ہو کہ "ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں"۔ ایسی صورت میں حقیقت اور واقعہ کے رشتہ کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ

واقعہ حقیقت کو پوری طرح ڈھک لے یعنی اس کے برابر ہو جائے؟

۴۔ ہر افسانہ میں امکانات کی دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی سما پاتا ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ متعلقہ امکانات کے باقی حصہ سے اس کا کیا رشتہ ہوتا ہے؟

اسی طرح کے چند سوالات اور ہیں جن میں سے بعض مسائل پر شاملِ کتاب مضامین میں بحث کی گئی ہے۔ عابد سہیل تنقید میں توازن کے قائل ہیں کتاب کے پیش لفظ میں واضح الفاظ میں لکھتے ہیں

> "میں ادب میں فوقی درجہ بندی (Hierarchy) کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے ایسے کسی خیال کی ہمنوائی کا سوال ہی نہیں، چہ جائیکہ اس کی وکالت۔"(۴۷)

ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے عابد سہیل فکشن کے وسیع امکانات اور واجب تقاضو کو بہتر طور پر سمجھتے تھے اسی لئے انھوں نے اس کتاب میں فکشن کے کچھ تقاضے اور مطالبات پیش کئے ہیں جو افسانوی تنقید میں فکر و خیال، تجربات و مشاہدات، بیانیے اور سب سے اہم "وقت" کے معیار متعین کرتی ہے جن سے انحراف کر کے اچھے فکشن کی تخلیق ممکن نہیں۔

☆ افسانیات

یہ عابد سہیل کی آخری کتاب ہے جو ان کی زندگی میں منصۂ شہود پر نہ آسکی۔ ان کی اہلیہ انیس نصرت نے پس مرگ یہ کتاب ترتیب دی اور 2017 میں ایم۔ آر۔ پبلی کیشن سے شائع کرائی۔ کتاب کے آغاز میں پس نوشت کے عنوان کے تحت وہ کتاب کے نام "افسانیات" کے حوالے سے لکھتی ہیں

> "اس مجموعے کا نام مرحوم نے "افسانیات" مقرر کیا تھا۔ اردو میں افسانے سے متعلق تحریر کے لئے "افسانوی" کی اصلاح (اصطلاح) بعض اوقات استعمال ہوتی ہے۔ (مثلاً افسانوی تنقید) لیکن افسانے یا عمومی طور پر Fiction کے بارے میں بحث و مباحثہ کے لئے اردو میں شاید کوئی لفظ نہیں ہے۔ اور شاید اسی لئے مرحوم نے "افسانیات" کی اصطلاح وضع کی تھی جو میرے خیال میں نہایت مناسب ہے۔"(۴۸)

اس کتاب میں دو ملاقاتیں، "نظریات" کے تحت افسانوں سے متعلق دو مضامین، مطالعے کے زیرعنوان "قمر رئیس اور افسانے کی پرکھ: یلدرم سے رتن سنگھ تک اور متعدد افسانوں کے تجزیوں کے علاوہ عابد سہیل کے تین غیر مطبوعہ افسانے اور غیر مرئی انسان ایچ۔جی۔ویلز کے ناول کے ترجمہ کا دیباچہ شامل ہے۔مصنف نے کتاب کے پیش لفظ میں ایک مضمون "نثر افسانہ اور سروکار" کا ذکر کیا ہے جس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکی۔مصنف مضمون کے ضائع ہو جانے پر اظہا افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> یہ ایک نظریاتی مضمون ہے اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ لفظی یا لسانی حقیقت (Verbal Reality) اور غیر لفظی یا غیر لسانی حقیقت کی بحث سے افسانوی دنیا اور افسانوی ادب کے بعض مسائل کو سمجھنے کا ارادہ تھا لیکن افسوس یہ کام کوتاہی پرواز کی نذر ہو گیا۔(۴۹)

کتاب کا آغاز عابد سہیل کے ایک انٹرویو سے ہوتا ہے جو ممتاز عالم نے 2006 میں لیا تھا پھر اس پر نظر ثانی 2015 میں کرنے کے بعد مذکورہ کتاب میں شائع کیا گیا دوسری تحریر نیر مسعود اور انیس اشفاق سے کی گئی بات چیت پر مشتمل ہے۔یہ گفتگو عابد سہیل نے ماہنامہ "ایوان اردو" کے لئے لکھنؤ میں ریکارڈ کی تھی۔یہ تحریر افسانوی تنقید کے چند پہلوؤں کو موضوع بنا کر کی گئی ہے گفتگو کا آغاز نیر مسعود اس طرح کرتے ہیں

> "عابد سہیل صاحب آپ کو یاد ہوگا، یہ واقعہ آپ ہی نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک بچہ غلطی سے اسکول کے کمرے میں بند رہ گیا تھا اور لمبی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔وہ بچہ اس کمرہ میں رہا، کاغذ کھاتا رہا، دیوار پر لکھتا رہا، غلطی نہیں کروں گا۔" سزا کے طور پر اسے بند کیا گیا تھا اور غلط اطلاع والدین کو دے دی گئی تھی کہ وہ اسکول سے جاچکا ہے۔یہ واقعہ ایسا دلدوز تھا کہ آپ نے بھی کہا تھا اور مجھے بھی کئی روز تک نیند نہیں آئی تھی۔اس واقعہ کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ بے حد دلدوز ہونے کے باوجود اس پر اچھا افسانہ نہیں بن سکتا۔یعنی اس واقعہ کو من و عن افسانے میں دہرا دیں تو الزام لگے گا کہ آپ نے اس بات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔یہ کیا معاملہ ہے جب کہ افسانہ حقیقت کو ذرا زیادہ شدید بنا کر پیش کرنا چاہیئے۔"(۵۰)

اس کے بعد گفتگو شروع ہوتی ہے اور عابد سہیل اس کا جواب دیتے ہیں جس میں انیس اشفاق بھی شریک ہوجاتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں زیادہ تر تحریریں افسانوی ادب سے ہی متعلق ہیں جن سے فکشن تنقید کی ممکنہ وسعتوں اور پیش آنے والی الجھنوں کے حل کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"افسانیات" نظریاتی اعتبار سے افسانہ کی تفہیم میں بلاشبہ اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔

حواشی

(۱)فن ترجمہ نگاری، پروفیسر ظہولالدین، کلاسک آرٹ پرنٹرز نئی دہلی، 2006، صفحہ 27

(۲)(محمد حسن، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتب قمر رئیس)

(۳)ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی 1976، صفحہ 14

(۴)شہباز حسین، فن ترجمہ نگاری، مرتب خلیق انجم، ثمر آفسٹ نئی دلی 1996 صفحہ 63-62

(۵)(ترجمہ فن اور روایت، مرتب نثار احمد قریشی، صفحہ 4-3)

(۶)ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی 1976، صفحہ 189

(۷)ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی 1976، صفحہ 21

(۸)اردو ترجمہ کی روایت مغرب سے تراجم کی دوصد سالہ سفر 1786 تا حال، مرزا حامد بیگ، دوست پبلی کیشنز 2016، صفحہ 161

(۹)ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی 1976، صفحہ 190

(۱۰)اردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب، سید احتشام حسین، ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی 1976، صفحہ 201

(۱۱)غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، صفحہ 10-9

(۱۲)جو یا در ہا، عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی 2012، صفحہ 325

(۱۳)جو یا در ہا، عابد سہیل، اردو اکادمی 2012 صفحہ 326

(۱۴)افسانیات، عابد سہیل، مرتبہ انیس نصرت، ایم۔آر پبلی کیشنز نئی دہلی، ص 10

(۱۵)غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، صفحہ 12

(۱۶)جو یا در ہا، عابد سہیل، اردو اکادمی 2018 صفحہ 328

(۱۷)غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، صفحہ 15

(۱۸)غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، صفحہ 16

(۱۹)غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، صفحہ 116

(۲۰) غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، صفحہ 199

(۲۱)غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، صفحہ 22

(۲۲)درد کا شجر، عابد سہیل، عرشیہ پبلی کیشن 2012، صفحہ 12

)۲۳(https//:www.gutenberg.org/files/13416 / 13416-h/13416-h.htm

(۲۴)درد کا شجر، عابد سہیل، عرشیہ پبلی کیشن 2012، صفحہ 282

(۲۵)https://www.gutenberg.org/files/13416/13416-h/13416-h.htm

(۲۶)درد کا شجر، عابد سہیل، عرشیہ پبلی کیشن 2012، صفحہ 285

(۲۷)حرف کائنات(اقوال زریں)،عابد سہیل،تخلیق کار پبلشرز دہلی2010،صفحہ 14-13
(۲۸)حرف کائنات(اقوال زریں)،عابد سہیل،تخلیق کار پبلشرز دہلی2010،صفحہ 15
(۲۹)حرف کائنات(اقوال زریں)،عابد سہیل،تخلیق کار پبلشرز دہلی2010،صفحہ 158
(۳۰)حرف کائنات(اقوال زریں)،عابد سہیل،تخلیق کار پبلشرز دہلی2010،صفحہ 9
(۳۱)(رحمن رنگ،مصنف عابد پیشاوری،مرتب عابد سہیل،صفحہ 101،کاکوری پریس2009،(
(۳۲)(رحمن رنگ،مصنف عابد پیشاوری،مرتب عابد سہیل،صفحہ 110،کاکوری پریس،2009)
(۳۳)(رحمن رنگ،مصنف عابد پیشاوری،مرتب عابد سہیل،صفحہ 11-12،کاکوری پریس،2009)
(۳۴)(رحمن رنگ،مصنف عابد پیشاوری،مرتب عابد سہیل،صفحہ 18،کاکوری پریس،2009)
(۳۵)"(رحمن رنگ،مصنف عابد پیشاوری،مرتب عابد سہیل،صفحہ 111،کاکوری پریس،2009)
(۳۶)(باغات،عابد سہیل(مترجم)نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا2004،صفحہ 7)
(۳۷)(باغات،لئیق فتح علی اور مترجم،مشمولہ نیا دور،دسمبر 2004)
(۳۸)(باغات،لئیق فتح علی اور مترجم،مشمولہ نیا دور،دسمبر 2004)
(۳۹)(باغات،لئیق فتح علی اور مترجم،مشمولہ نیا دور،دسمبر 2004)
(۴۰)اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل،مرتب عابد سہیل صفحہ 13،اردو اکادمی اتر پردیش 1981
(۴۱)اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل،مرتب عابد سہیل صفحہ 106،اردو اکادمی اتر پردیش 1981
(۴۲)اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل،مرتب عابد سہیل صفحہ 108،اردو اکادمی اتر پردیش 1981ن
(۴۳)(انتخاب مضامین احمد جمال پاشا،مرتب عابد سہیل،صفحہ 9،اردو کادمی اتر پردیش1988)
(۴۴)(انتخاب مضامین احمد جمال پاشا،مرتب عابد سہیل،صفحہ 11،اردو کادمی اتر پردیش1988)
(۴۵)عابد سہیل بند کتاب سے کھلی کتاب تک،مرتبہ شکیل احمد،ایم آر پبلی کیشن 2016
(۴۶)ایک عہد عابد سہیل کے نام،عبدالصمد،نیا دور لکھنؤ،اگست-ستمبر 2016 صفحہ 94
(۴۷)(فکشن کی تنقید،عابد سہیل،پاریکھ آفسٹ پرنٹنگ پریس لکھنؤ،2002،صفحہ 10)
(۴۸)افسانیات،عابد سہیل،مرتبہ انیس نصرت،ایم۔آر پبلی کیشنز نئی دہلی،صفحہ 8
(۴۹)افسانیات،عابد سہیل،مرتبہ انیس نصرت،ایم۔آر پبلی کیشنز نئی دہلی،صفحہ 5
(۵۰)افسانیات،عابد سہیل،مرتبہ انیس نصرت،ایم۔آر پبلی کیشنز نئی دہلی،صفحہ 5 صفحہ 19